# سورة الحدید

اس میں ۲۹ آیتیں ہیں یہ مدنی سورۃ ہے۔ابن عباس' ابن زبیر اور جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی جبکہ صاحب کشاف کا کہنا ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے۔مروی ہے کہ یہ سورۃ ان کنتم مومنین تک عمر بن خطاب کی بہن کے پاس تھی حضرت عمر نے دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ بہن نے جواب دیا یہ قرآن ہے محمد رسول اللہ علیہ وسلم پر اللہ نے نازل کیا ہے۔جس پر وہ غضب ناک ہوئے اور وہ ماجرا ہوا جو سب کو معلوم ہے۔اس کی تائید صاحب الکشاف کا قول بھی کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) **سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (ترجمہ:۔زمین وآسمان میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح کرتی ہے) یعنی ہر وہ شئے جو ان دونوں کے اندر موجود ہے اس کی تنزیہ پاکیزگی بیان کرتی ہے۔تسبیح کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ **وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ** (ترجمہ:۔اور وہ غالب' حکمت والا ہے) یعنی ایسا زبردست وغالب جس کا ہر فعل حکمت وصواب ہے۔

(۲) **لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (ترجمہ:۔زمین اور آسمان کی حکمرانی اسی کی ہے۔) اس سے مراد کلی تصرف اور مکمل تدبیر ہے۔ان دونوں میں چاہے وہ تکوین (عدم سے وجود میں لانا) ایجاد ہو' فنا کر دینا ہو' معدوم کر دینا ہو' تمام کی تصرفات کلّی اور جزوی سب کی سب' کیونکہ وہ ہر شئے کا خالق ہے۔اور ہر جنس' ہر نوع' ہر شخص اس کے جوہر واعراض سمیت سب کا عالم ہے۔سب کچھ اس کی مخلوق ہے۔بس خالق کے لئے لازم ہے کہ وہ اس کے وجود سے پہلے اور اس کے وجود کے بعد ہر غرض وغائت سے باخبر ہو۔اسی لئے ہر شئی اس کی معلول وملک ہے اور اللہ اس کا خالق ومالک ہے۔بعض اہل اسلام فلسفیوں کا کہنا ہے کہ وجود کے عطا کرنے میں واجب الوجود کی تاثیر ہوتی ہے۔ماھیات میں تاثیر نہیں ہوتی پس واجب الوجود' سواد کو موجود کر دیتا ہے۔کیا یہ محال ہے کہ وہ سواد کو سواد کر دے؟ بعض نے کہا ہے کہ اگر وہ بالفاعل سواد کا سواد کرنے والا ہوتا تو اس کے فاعل کو عدم کو فرض کرنے سے یہ لازم آتا کہ سواد' سواد نہ رہے۔اور یہ محال ہے میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ اگر ماھیات بنانے والے کی تاثیر کا غیر ہوتیں تو وہ یا تو واجب ہوں گی یا ممکن ہوں گی، پھر اگر وہ واجب ہوں گی تو قدیم ذاتوں کی کثرت لازم آئے گی حالانکہ وہ باطل ہے۔اور وہ اگر ممکن ہوں گی تو ممکن اپنی ذات اور وجود میں بنانے والے کا محتاج ہوتی ہے اگر وہ بنانے والے سے بے نیاز ہوگی تو وہ واجب الوجود ٹھیرے گی جب کہ اس کا باطل ہونا پہلے ہی بیان ہو چکا ہے۔پس لازم ہے کہ وہ ممکن ہی ہو اور اس صورت میں اس کا اپنی ذات اور وجود میں بنانے والے کا محتاج ہونا لازم ٹھیرا۔یہی رائے فلاسفہ کی ہے اور محقق صوفیاء کی۔پس حق بات یہ ہے کہ ماہیات اولاً اور بالذات اپنے بنانے والے کے لئے **مجعولۃً** (بنی ہوئی) اور بالعرض اس کی صفات سے متصفہ ہوتی ہیں۔پس اگر آپ یہ کہیں کہ جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ ویسا ہی ہو تو **مجعولۃً ذاتیۃ** لازم آئے گی اور وہ اس سے عبارت ہے کہ ماہیت کا ثبوت جاعل (بنانے والے) کے سبب سے ہو اور **مجعولۃً ذاتیۃ** کا قول باطل ہو جائے گا۔

اور پھر ماہیات میں جاعل کے موثر ہونے کا قول باطل ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ "جعل" بسیط ہے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ نفس ماہیت کے ثبوت کے مصداق "جاعل" ابدع ہے اس معنی میں کہ اسے اس نے "لیس" سے "الیس" کی طرف نکالا ہے اور ایسا ہونا جائز ہے۔ اور اہل حق کے نظریہ پر دلیل یہ ہے کہ ممکن موجود میں تین چیزیں ہیں۔ ماہیت' وجود' اور ماہیت وجود کے ساتھ متصف ہونا۔ جبکہ وجود انتزاعی امر ہے یعنی وہ موجوات سے ختم ہو جاتا ہے اور یہی اس کے انتزاع کی منشاء ہے۔ اسی طرح سے ماہیت کا وجود کے ساتھ متصف ہونا بھی ہے بس وہ بھی محکوم علیہ اور محکوم الیہ سے الگ ہو جاتی ہے اور وہ ان دونوں پر موقوف ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ منتزع اشیاء نفس الامر میں موجود نہیں ہوتیں۔ پس ان دونوں معاملات پر "جعل" کا اثر واقع نہیں ہوگا۔ لہذا ماہیت کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور یہی حقیقی جعل ہے۔ البتہ یہ کہنا کہ وجود امر انتزاعی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ اگر وہ منضم ہوتا تو منضم متاخر کے وجود سے مقدم "منضم الیہ" وجود کی ذات کو مقدر ماننے سے دور مستحیل لازم آتا۔ اور غیریت کی تقدیر پر تسلسل بھی لازم آتا۔ اور جبکہ اس کے منفصل ہونے کا احتمال باطل ہے۔ کیونکہ "حمل" اس کی نفی کرتا ہے۔ اس بیان کی تفصیل منطق کی تصنیف "مسلم العلوم" کی شروعات میں موجود ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہاں دیکھ لیں۔ امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہ اعتراض دو وجوہات سے رد کیا جا سکتا ہے پہلی یہ کہ ماہیت کا وجود سے موصوف ہونا یہ ثبوتی معاملہ نہیں اگر ثبوتی ہو تو اس کی ماہیت اور وجود بھی ہوتا اور اس وقت اس ماہیت کا وجود سے موصوف ہونا اس پر امر زائد ہو جاتا اور تسلسل لازم آتا۔ حالانکہ وہ محال ہے جب ماہیت کا وجود سے موصوف ہونا امر ثبوتی نہیں ہے تو یہ کہنا بھی محال ہے کہ ماہیت اور وجود میں فاعل کی تاثیر نہیں ہے بلکہ اس کی تاثیر تو وجود کے ساتھ ماہیت کی موصوفیت میں ہے۔ دوسری وجہ ہے کہ اگر اس موصوفیت کو امر ثبوتی مان بھی لیا جائے تو بھی اسے فاعل ک اثر ماننا محال ہوگا۔ ورنہ اس فاعل کے عدم کو فرض کرنے سے یہ لازم آئے گا کہ موصوفیت' موصوفیت نہ رہے۔ پس ظاہر ہوا کہ ان کا ذکر کردہ شبہ اگر پورا ہو جائے اور ثابت ہو جائے تو سرے سے تاثیر و موثر کی نفی لازم آئے گی۔ بلکہ جس طرح ماھیات واجب الوجود کی تاثیر سے موجود ہوئی ہیں اس طرح ماہیات واجب الوجود کی تاثیر سے ماھیات بنی ہو۔ پس جب یہ حقائق سامنے آ گئے تو برہان عقلی کے ذریعہ **له ملک السموت والارض** کی سچائی ظاہر ہوگئی بلکہ اس کے کمال ملک کی بہ نسبت آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت ایک ذرے سے بھی کم تر ہے۔ اسے تو اسکی بادشاہت سے کوئی نسبت ہی نہیں کیونکہ آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی متناہی ہے حالانکہ اس کی بادشاہی کا کمال لامتناہی ہے جبکہ متناہی کو لامتناہی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ البتہ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی اسی لئے کہا ہے کہ وہ مشاہد اور محسوس ہے اور اگر مخلوق کی عقلیں ضعیف ہوتی ہیں بہت ہی کم محسوس سے معقول کی طرف ترقی کر سکتے ہیں۔ **يُحْيٖ وَيُمِيْتُ** (ترجمہ:۔ وہ ہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے) یعنی زندگی اور موت بخشنا اس کی قدت کا ایک نمونہ ہے۔ **وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ** (ترجمہ:۔ وہ ہر شئے پر) یعنی وہ ہر ممکن پر۔ **قَدِيْرٌ** (ترجمہ:۔ قادر ہے) یعنی اس کی قدرت ہر جگہ پہونچنے والی ہے۔

(۳) **هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** (ترجمہ:۔ وہی اول وہی آخر

وہی ظاہر وہی باطن ہے اور ہر شئے کو جاننے والا ہے۔) یہ آیت صوفیاء کرام کے دلائل میں سے ایک ہے۔ اس کی تفسیر میں مفسروں نے اختلاف کیا ہے۔ بخاری نے امام یحییٰ کا قول لکھا ہے کہ ہر شئے پر ''ظاہر'' علمی اعتبار سے اور علمی طور پر ہر شئے پر باطن ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہا۔ ہمارے شیخ یحییٰ نے جو ابن زیاد الفراء ہیں اپنی کتاب کا نام ''معانی القرآن'' رکھا ہے۔ اسمیں یہ حدیث بیان کی گئی ہے امام احمد نے ابی ہریرہؓ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے منسوب کیا کہ آپ سوتے وقت دعا کرتے تھے **اللھم رب السموت السبع ورب العرش العظیم ربنا ورب کل شئی منزل التوراۃ والانجیل والفرقان خالق الحب والنوٰی لا الہ الا انت اعوذبک من شر کل شئی انت آخذ بناصیۃ انت الاول فلیس قبلک شئی وانت الآخر فلیس بعدک شئی وانت الظاھر فلیس فوقک شئی وانت الباطن فلیس دونک شئی. اقض عنّا الدین واغننا من الفقر.** (اے سات آسمانوں کے اور عظیم عرش کے پروردگار اے ہمارے اور ہر شئی کے رب اے التوراۃ' الانجیل اور قرآن کو نازل کرنے والے اے دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر (نمو) نکالنے والے تیرے سوا کوئی بھی معبود نہیں میں ہر شئے کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں تو پکڑنے والا ہے۔ پیشانی سے' تو ہی اول ہے تجھ سے پہلے کوئی نہیں ہے اور تو ہی آخر ہے تیرے بعد کوئی نہیں اور تو ہی ظاہر ہے تیرے اوپر کوئی نہیں۔ اور تو ہی باطن ہے تیرے سوا کوئی نہیں۔ ہمیں قرض سے نجات دے اور فقر وتنگدستی سے بے نیاز فرما) ابوالعلی الموصلی نے بھی اسی کی مثال ایک حدیث حضرت عائشہؓ کی سند سے تخریج کی ہے۔ ابوعیسیٰ ترمذی نے اس آیت کی تفسیر ابوھریرہؓ سے بیان کی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ نبی اللہؐ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ بادل آ گئے آپ نے فرمایا جانتے ہو یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے آپؐ نے فرمایا یہ بادل ہیں یہ زمین کے پانی بردار ہیں جنہیں اس قوم کی طرف لے جایا جا رہا ہے جو نہ تو اللہ کے شکر گذار ہیں اور نہ ہی اس کی عبادت کرنے والی پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو اوپر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا بلند محفوظ چھت اور رکی ہوئی لہریں (امواج) ہیں پھر آپؐ نے سوال کیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے صحابہ نے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے آپؐ نے فرمایا تمہارے اور ان کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اس کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے تو آپؐ نے فرمایا۔ اس کے اوپر اتنی دور تک ایک دنیائے آسمانی ہے ہر دو آسمان کے مابین پانچ سو برس کی مسافت ہے۔ یہاں تک ساتویں آسمان کی تعداد بتلائی ہر دو آسمانوں کے درمیان اتنی ہی دوری ہے جیسی کہ زمین و آسمان کے مابین پھر آپؐ نے ان سے سوال کیا کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے اوپر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اس کے اوپر عرش ہے اور اسکے اور آسمان کے درمیان دو آسمانوں کا فاصلہ ہے۔ آپؐ نے پھر دریافت کیا کیا تمہیں معلوم ہے تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ''اعلم'' ہے جو کچھ آپؐ نے فرمایا بلاشبہ وہ ارض ہے پھر آپؐ نے پوچھا تمہیں پتہ ہے کہ اس کے نیچے کیا ہے؟ انہوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے آپؐ نے صراحت فرمائی اس کے نیچے بلاشبہ دوسری زمین ہے دونوں کے درمیان پانچ سو برسوں کی

مسافت ہے۔ یہاں تک سات زمین گنوا دیں۔ اور ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ اگر تم رسی کو لٹکاؤ نچلی زمین تک تو وہ اللہ پر گرے گی۔ پھر آپ نے پڑھا " **هو الاول ' والآخر واالظاهر والباطن وهو بكل شئى عليم** ابو عیسیٰ نے فرمایا یہ حدیث اس طریقہ سے عجیب ہے۔ اور بعض اہل علم نے وضاحت فرمائی ہے کہ وہ (شئی اللہ کے علم' اس کی قدرت۔ اس کے اقتدار پر واقع ہوگی۔ اس کا علم قدرت اور سلطنت ہر مقام میں ہے اور وہ عرش ہے۔ ابو بکر وراق نے فرمایا کہ ازلیت کے اعتبار سے وہ اول ہے اور ابدیت کے اعتبار سے وہ آخر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظاہر کے معنی ہیں ہر شئے پر عالی اور وہ ہر عالی پر غالب ہے اور باطن کے معنی ہیں جو ہر شئے کا باطن ہو یعنی ہر شئے کا باطن جانتا ہو۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ اس آیت کی تفسیر اکثر مفسرین کے لئے بہت مشکل ہے کیونکہ اس میں مذکورہ اسماء کی حقائق کے اعتبار سے بحث ہے جو انتہائی دقیق ہے اور بہت ہی گہرا راز ہے۔ جس کا ادراک متوسط عقل والے نہیں کر سکتے پس جو بھی اس بحث میں پڑا وہ پریشان ہی ہوا۔ البتہ امام رازی نے اس بحث پر متکلمین کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ قرآن اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ذات بلند ہے اور اپنے علاوہ ہر ایک کے لئے اول ہے اور دلیل و براہین بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ واجب کے علاوہ ہر چیز ممکن ہے اور ممکن حادث ہوتا ہے اور وہ واجب اپنی ذات کے علاوہ ہر ایک کے لئے اول ہے اور یہ جو ہم نے کہا کہ واجب کے علاوہ ہر چیز ممکن ہے یہ اس لئے کہ اگر دو چیزیں ذاتی طور پر واجب پائی جائیں تو وہ وجوب ذاتی میں مشترک ہوجاتیں اور تعین کے اعتبار سے الگ الگ ہوجاتیں۔ اور **ما به المشاركة** غیر ہے **ما به الممائزه** سے غیر ہوجاتی پس ہر ایک اس کے اجزاء میں سے ہوجاتا۔ اگر وہ واجب ہوتا تو اجزاء وجوب میں مشترک ہوجاتے اور خصوصیت میں الگ الگ ہوتے پھر تمام اجزاء بھی مرکب ہوجاتے اور ایک تسلسل لازم آجاتا اور اگر وہ دونوں واجب نہ ہوتے یا کوئی ایک واجب نہ ہوتا تو تمام کے تمام متقوم بہ کا واجب نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ہوتا پس ثابت ہوا واجب کے علاوہ سب ممکن ہے۔ اور ہر ممکن محدث ہوتا ہے کیونکہ وہ موثر کا محتاج ہوتا ہے اور یہ دو حالتوں سے خالی نہیں یا تو وہ وجود کا حال ہوگا یا عدم کا حال۔ اگر وہ وجود کا حال ہے تو یا تو حال بقاء ہوگا جو کہ محال ہے۔ کیونکہ موجود ایجاد کا متقاضی ہے اور تحصیل حاصل محال ہوتی ہے اور اگر حالِ عدم ہے تو لازم ہوگا کہ ہر ممکن محدث ہو پس ثابت ہوا کہ واجب کے علاوہ ہر چیز محدث ہے اور واجب کی محتاج ہے ایسے میں واجب اپنے علاوہ ہر چیز سے پہلے ہوگا اور اپنے علاوہ ہر چیز کا اول ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تقریر بیمار کو شفایاب نہیں کرسکتی۔ شیخ بوعلی سینا نے "اشارات" میں جو ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ پیش کئے دیتے ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ ہر حادث اپنے وجود سے پہلے یا ممتنع الوجود ہوگا یا ممکن الوجود پہلی بات محال ہے اور دوسری حق ہے اس صورت میں اس چیز کے لئے اس کے وجود سے پہلے اس کے وجود کا امکان موجود ہے۔ اور اس کے وجود کا امکان نہ ہو جو کہ اس پر قادر کی قدرت ہے۔ کیونکہ غیر مقدور علیہ کے محال ہونے کا سبب وہ ہے اس کا فی نفسہ غیر ممکن ہونا۔ اور بعد مقدور علیہ کے غیر محال ہونے کا سبب فی نفسہ ممکن ہونا ہے۔ اور کوئی بھی چیز اپنی ذات کے لئے سبب نہیں ہوتی۔ نیز کسی چیز کا ممکن ہونا فی نفسہ اس کے لئے ایک امر ہے۔ اور مقدور علیہ ہونا قیاسی امر ہے۔ ایسے میں اس کا ممکن ہونا مقدور علیہ

سے ایک مختلف معاملہ ہے۔اور یہ امکان بذات خود کوئی معقول شئے نہیں ہے۔کیونکہ امکان کسی بھی چیز کے لئے اس کے وجود کے قیاس سے ہوتا ہے جسے کہ کہا جائے کہ سفیدی کا پایا جانا ممکن ہے یا اس کا دوسری چیز میں بدل جانا۔یعنی جسم کا سفید ہونا ممکن ہے ایسے میں دوسری چیز کے قیاس کے اعتبار سے معقول بات ہے۔جو ایک اضافی امر ہے۔اور اضافی امور اعراض ہوتے ہیں اور اعراض اپنی جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ایسے میں حادث سے اس کا امکان اور موضوع متقدم ہو جائے گا اور وہ امکان موضوع میں حادث ہونے والے وجود کی بہ نسبت موضوع کی قوت بنے گا۔پس وہ وجود کی قوت ہے اور اس امکان کی طرف قیاس کرتے ہوئے جس کا وہ عرض ہے اور اس حادث کی طرف قیاس کرتے ہوئے بشرطیکہ اوہ اس کا عرض ہو موزوں ہوگا۔اور اگر وہ صورت ہوگا تو اسکی طرف قیاس کرتے ہوئے مادہ ہوگا۔یہ الاشارات میں شیخ الرئیس ابوعلی سینا کے بیان کا خلاصہ ہے جسے محقق طوسی نے اپنی شرح میں بیان کیا ہے۔اور میں کہتا ہوں کہ اس میں ابھی ایک شئے باقی ہے۔جس کا بیان یہ ہے کہ حادث کے فی نفسہ ممکن ہونے کا معنی ہے کہ نہ تو وہ واجب ہوتا ہے اور نہ ہی ممتنع۔اس لئے کہ اگر وہ واجب ہوگا تو وہ واجب ذات باری تعالیٰ کی تاثیر کو قبول کرنے والا نہیں ہوگا۔اور نہ اس کا مقدور ہوگا اور اگر وہ اس کی تاثیر کا قبول کرنے والا ہوگا تو "جاعل" کے جعل اور واجب کی قدرۃ کا واجب ہونا ممتنع ہو جائے گا۔اسی طرح اگر وہ ممتنع ہوا تو کسی بھی وقت اور کسی بھی زمانے میں پایا نہیں جائے گا اور جب وہ بعض اوقات اور احیان میں پایا جائے گا تو اس کا ممتنع ہونا محال ہو جائے گا۔پس یہ دونوں شکلیں باطل ثابت ہو گئیں تو لازمی ہے کہ وہ اس کا ممکن ہونا لازم ہے اور ہر ممکن بالذات جاعل کی محتاج ہوتی ہے۔جو اس کی علت موجدہ ہوتا ہے۔پس واجب ہے کہ وہ اس سے بالذات متاخر بھی ہو جیسے کہ مجعول اور معلول کی شان ہے۔پس لازم ہے کہ واجب تعالیٰ کی ذات ہر ماسوا سے پہلے اور ہر ماسوا کا اول ہو اور یہی معنی ہیں **هو الاول** کے البتہ ذات باری تعالیٰ کا **هو الآخر** ہونا اس طرح ہے کہ وہ فاعل مختار ہے موجب نہیں اس لئے کہ اگر وہ اس معنی میں آخر ہوتا کہ وہ فاعل اور موجب ہے تو معلول کا علّت موجبہ سے پیچھے آنا واجب ہوتا جبکہ ایسا ہونا باطل ہے جیسے کہ فلاسفہ کا بھی یہی مذہب ہے البتہ اگر وہ اس اعتبار سے آخر ہو کہ وہ جاعل مختار ہے تو وہ صحیح ہے کہ جاعلِ مختار کا اشیاء کو ایجاد کرنا اور فنا کرنا صحیح ہے۔پس وہ ہر ایک کی فنا کے وقت اکیلا باقی ہوگا۔اس کے ساتھ کچھ نہ ہوگا اسی مفہوم کی طرف اللہ نے **كل شئي هالك الا وجهه** میں اشارہ فرمایا ہے۔البتہ اللہ کا ظاہر و باطن ہونا تو امام رازی نے فرمایا ہے کہ وہ وجود کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ آپ کائنات و ممکنات کی کوئی چیز نہیں دیکھیں گے۔مگر وہ اس کے وجود و ثبوت پر دلیل ہوگی۔اور تغیر جہات سے اس کے بری ہونے اور حقیقت ہونے پر دلیل ہوگی۔البتہ ان کا باطن ہونا کئی وجوہ سے ہے امام رازی فرماتے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کی ماھیت بشر کے لئے قطعاً غیر معقول ہے اس بات پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ انسان شئی کی ماھیت کا تصور نہیں کرتا۔مگر وہ وجدان کے طور پر اپنے نفس سے اس کا ادراک کرتا ہے جیسے رنج و تکلیف اور لذت وغیرہ یا وہ اس کا حسی طور پر ادراک کرتا ہے جیسے رنگ، ذائقے اور دیگر محسوسات۔پس جو ذات اس طرح نہ ہو تو انسان کے لئے اس کی ماھیت اور مخصوص ھویۃ کا تصور کرنا مشکل ہے۔اللہ جل جلالہ کی ذات اس طرح نہیں ہے یعنی وہ غیر مدرکہ (جس کا ادراک نہ کیا جا سکے) ہے پس وہ انسان کے لئے سمجھ میں آنے والی ذات نہیں ہے۔نیز اس پر یہ بات بھی

دلالت کرتی ہے کہ معلوم منہ تخلیق کے وقت یا تو وجود ہوگا یا سلوب ہوگا یعنی وہ جسم و جوہر نہیں ہوگا یا وہ اضافت ہوگا وہ یہ کہ وہ اس کی ایسی ایسی شان کا معاملہ ہوگا جبکہ حقیقت مخصوصہ ان تمام امور کے مغائر ہے وہ غیر معقولہ ہے اور اس پر یہ بات دلالتہ کرتی ہے کہ عقل کے نزدیک سب سے ظاہر ترین چیز اس ذات کا ان مخلوقات کا خالق ہونا اور ان سے مقدم ہونا ہے۔ اور آپ اس اولیت کی معرفت میں عقل کی حیرانگی اور وحشت زدگی سمجھ چکے ہیں۔ پس ہمارے اس بیان سے ظاہر ہوا وہ ذاتِ سبحانہ تعالیٰ اول ہے' آخر ہے' ظاہر ہے اور باطن ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا ظاہر ہونا اس طرح ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے اور نور ظہور کی حقیقت ہوتا ہے اس لئے کہ جو چیز نور کی حقیقت نہ ہو وہ نور سے ہی ظاہر ہوتی ہے جبکہ نور بنفسہ ظاہر اور بذاتہ متجلی ہوتا ہے البتہ اس کا باطن ہونا یعنی پوشیدہ ہونا وہ اس کے ظہور کی شدت اور انتہائی واضح ہونے کی وجہ سے ہے اور اسی وجہ سے وہ ضمائر وانظار پر مخفی ہے۔ اور عقول وابصار سے محجوب ہے۔ پس اس کی ذات بذاتہ اشیاء کے لئے متجلی ہے۔ اور اس کی تجلی کے قبول کرنے سے بعض ذوات کے قاصر ہونے کی وجہ سے وہ حجاب میں ہے لیکن حقیقتاً حجاب محجوبین میں ہے۔ اور وہ حجاب قصور' ضعف اور نقص ہے اور اس کی تجلی اس کی ذات کے حقیقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی ذات کے معنی سوائے اس کی ذات کی صراحت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی صفات اس کی ذات سے اضافی شئے نہیں ہیں۔ جیسے کہ ربانیون (اہل اللہ) نے اس کی وضاحت بھی فرمائی ہے کیا آپ نے سورج کو دیکھا ہے جو حسّی انوار میں سے شدید ترین نور اور نظر آنے والی روشنیوں میں سے مضبوط ترین روشنی ہے وہ اپنے فرط ظہور کی وجہ سے حاسہ بصریہ پر کس طرح محجوب بنتا ہے یہاں تک کہ اپنی قوت کی ضعف کی وجہ سے حجاب کے بغیر اس کے ملاحظہ کی طاقت نہیں رکھتی۔ مثلاً آئینہ' پانی اور باریک بادل تو حق سبحانہ تعالیٰ کی ذات بھی ایسی ہی ہے اگر چہ اس کی حقیقت کا احاطہ عقول وافکار نہیں کر سکتے۔ اور اس کی ذات کا ادراک بصائر وابصار نہیں کر سکتے۔ مگر اس کی ذات کے چہرہ جمال کا نقاب نور کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور اس کی ذات کا حجاب ظہور کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اور شہوات کی کدورات سے پاک ہونے کے بعد قلوب کو منور و متجلی ہونے سے نہیں روکتی۔ مگر شدت اشراق اور آنکھوں کی کمزوری تو پاک ہے وہ ذات جس کا نور مخلوق کی آنکھوں سے مخفی ہے اور فرط وضوح کی وجہ سے اس کا ظہور عقلوں سے حجاب میں ہے۔ وہ ہر شئے کو جاننے والا ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کے نور سے اپنی ذات پر تمام اشیاء کو ظاہر کرتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کو جانتا ہے تو دوسری چیز کے پاس اس کے ظہور کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور اللہ ہر شئے کا خالق ہے۔ زمینوں اور آسمانوں میں کوئی شئے اس پر مخفی نہیں ہے تمام اشیاء کی ملکوت اسی کے ہاتھ میں ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی ہستی ایسی اول ہے جس سے ہر چیز کو اسی سے وجود ملا ہے۔ سورج کی روشنی کے فیضان کی طرح اور وہ ذاتِ آخر ہے کہ ہر وجود اسی کی طرف لوٹ کے آئے گا کیونکہ اشیاء کا وجود ذاتی نہیں ہے تو اس کا وجود اشیاء کو وجود بخشنے والا ہے۔ اور وہ ذات ظاہر ہے کہ اسی سے خارجی صورتوں کے لباس میں ملبوس اجسام متجلی ہوتے ہیں اس طرح کہ اس کا علم ازلی ان کو گھیرے ہوتا ہے۔ پس وجود کی حقیقت ایک ہی ہے۔ اسی وجہ سے ابوعلی سینا نے ''الشفاء'' میں کہا ہے کہ وجود ایک ہے اور موجود متعدد ہے۔ پس موجودات کا متعدد ہونا عوارض کے طور پر ہے نہ کہ نفس وجود کے طور پر نیز وہ موجودات امورِ وجودیہ ہیں۔ جن کا کسی چیز میں اجتماع دوسری چیز سے اس

کے ممتاز ہونے کا سبب بنتا ہے۔ یہی شیخ اکبر ابن العربی کا مذہب ہے اور اسی طرف جمور صوفیاء کا بھی میلان ہے اور ہم نے اس مسئلہ کی تشریح رسالۂ موسومہ "الشرح علی شرحِ الوحدت المطلقه" میں کی ہے جو کہ شیخ اکبر کی تصنیف یعنی شرح الوحدت المطلقه ہے۔

(۴) **هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ** (ترجمہ:۔ وہی ہے جس نے چھ ایام میں زمین وآسمان بنائے) دنیاوی دنوں میں جس کا پہلا دن اتوار اور آخری دن جمعہ ہے اور اگر وہ ان کی تخلیق کا ارادہ ایک ساعت یا اس سے بھی کم وقت میں کرتا تو کر سکتا تھا بلاشبہ اس نے ان کو چھ ایام میں تخلیق کیا نہ اس سے کم کیا اور نہ ہی زیادہ۔ اس لئے کہ چھ کا عدد کامل ہے۔ اور اہل ھندسہ کے نزدیک یہی وہ عدد ہے جس سے نصف (آدھا) ثلث صحیح اور چھٹا حصہ صحیح کسر کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ اور جب یہ اجزاء جمع ہوں تو اس سے یہی عدد حاصل ہوتا ہے اور اگر آپ نصف گنیں تو تین ہوگا اس کا تیسرا حصہ شمار کریں تو وہ دو ہوں گے۔ اور چھٹا گنتی کریں تو وہ واحد ہوگا۔ پس یہی وہ عدد کامل ہے ان کے نزدیک اس کے علاوہ اس طرح نہیں ہوتا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے تکمیل تخلیق کے لئے یہ عدد چنا۔ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** (ترجمہ:۔ پھر وہ عرش پر استقامت فرمائی۔ **یَعْلَمُ مَا یَلِجُ** (ترجمہ:۔ وہ جانتا ہے جو کچھ چیز کے اندر جاتی ہے) یعنی داخل ہوتی ہے۔ **فِی الْاَرْضِ** (ترجمہ:۔ زمین کے اندر) بارش اور اس کے اندر ہونے خزانے اور جواہرات۔ **وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا** (ترجمہ:۔ اور جو کچھ اس سے برآمد ہوتا ہے) نباتات، معدنیات وغیرھم۔ **وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ** (ترجمہ:۔ اور جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے) یعنی ملائکہ، رحمت، بارش، قہر اور عذاب۔ **وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا** (ترجمہ:۔ اور جو کچھ اس کی طرف چڑھتا ہے) یعنی ملائکہ، صالح نفوس، اور بندوں کے اعمال۔ **وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ** (ترجمہ:۔ تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) متکلمین کے خیال میں یہ علمی معیت ہے اور جبکہ صوفیاء میں سے محققین کے نزدیک یہ معیّت، معیّت الوجود یہ ہے کیونکہ وہ ذات ہر چیز کی اصل الوجود ہے۔ اور یہ عین ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو حکماء صوفیاء محققین کا نقطہ نظر ہے۔ **وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ** (ترجمہ:۔ اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے) اللہ پر اپنی مخلوق کے اعمال بالکل پوشیدہ نہیں۔ امام ابوالحسن اشعری نے فرمایا کہ اللہ کی بصارت سے مراد اس کا علم ہے جبکہ جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے ان کے خیال میں یہ اللہ کی صفت ثابتہ ہے۔

(۵) **لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ** (ترجمہ:۔ زمینوں اور آسمانوں کی حکومت اسی کی ہے اور اسی تک سارے امور پہنچتے ہیں) یعنی سارے تکوینی اور ترزیقی امور یعنی عدم سے وجود میں لانے والے اور ان موجودات کو رزق کی فراہمی کے معاملات۔ ترجع کو فعل معروف کے طور پر "تاء" پر زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ لیکن جمہور نے "تا" پر پیش کے ساتھ فعل مجہول کے طور پر ہی پڑھا ہے۔

(۶) **یُوْلِجُ الَّیْلَ** (ترجمہ:۔ وہ داخل کرتا ہے رات کو) یعنی رات کو دن میں شامل کر دیتا ہے۔ **فِی النَّهَارِ** (ترجمہ:۔ دن میں) اس طرح کہ رات میں کمی کر کے دن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ پس رات چھوٹی ہو جاتی ہے اور دن طویل ہو جاتا ہے۔

رات کا ذکر دن سے پہلے کیا گیا کیونکہ وہ دن سے پہلے ہوتی ہے اور دن کا وجود سورج کے وجود کے بعد ہے۔ **وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ** (ترجمہ:۔اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے) تاکہ رات طویل ہو جائے اور دن چھوٹا۔ **وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ** (ترجمہ:۔اور وہ دل کی باتوں سے باخبر ہے) یعنی قلوب میں پوشیدہ باتوں سے۔

(۷) **اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ** (ترجمہ:۔ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر) یعنی توحید کی تصدیق کرو۔ **وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ** (ترجمہ:۔اور خرچ کرو اس مال سے جس میں اس نے تم کو (اپنا) قائم مقام کیا ہے) یعنی تمہیں زمین پر اس نے خلفاء بنایا ہے۔ پس خرچ کرو اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں عطاء کیا ان اموال کو جو اس کا مستحق ہو۔ **فِيْهِ** (ترجمہ:۔جس میں) یعنی تم صرف تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہو تم اس مال کے مالک نہیں کیونکہ ان اموال کا مالک اور خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ **فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ** (ترجمہ:۔سو جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور خرچ کریں ان کے لئے بڑا ثواب ہے) یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لئے اللہ کے پاس بڑا اجر ہوگا۔ اور اس سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عثمان بن عفانؓ غزوۃ عسرت (تبوک) میں تین سو اونٹ کجاوں کے ساتھ ان کے نیچے بچھائے جانے والے کپڑوں کے ساتھ اور ان پر لدے ہوئے مال و اسباب کے ساتھ اور ایک ہزار دینار لے کر آئے اور رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پس وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔

(۸) **وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ** (ترجمہ:۔تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے) یہ استفہام ڈانٹ ڈپٹ (تہدید) اور ڈرانے (تنذیر) کے لئے ہے۔ **وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ** (ترجمہ:۔حالانکہ رسول تم کو اس بات کی طرف بلا رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ) جملہ حالیہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لا رہے ہو۔ اور حال یہ ہے کہ اس کا نبی ﷺ تمہیں ایمان و ہدایت کی طرف بلا رہا ہے وہ تمہیں ہدایت دے رہا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ اور تمہیں اللہ کی آیات تلاوت کر کے سنا رہا ہے۔ حجت اور برہان کے ساتھ طریق ایمان کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔ **وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ** (ترجمہ:۔اور خود خدا نے تم سے عہد لیا تھا) جملہ حالیہ ہے اور اس سے مراد وہ میثاق ہے جس کا ذکر اللہ نے کیا ہے یعنی الست بربکم قالو ا بلٰی ۔ جمہور نے قد اخذ کو فعل معروف کے طور پر پڑھا ہے اور ''تا'' کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اخذت۔ **اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (ترجمہ:۔اگر تم ان شہادتوں کی روشنی میں ایمان لاسکو تو) ایمان لے آؤ۔

(۹) **هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ** (ترجمہ:۔وہ اللہ ایسا ہے کہ اپنے بندہ (محمدؐ) پر واضح آیتیں نازل کرتا ہے) یعنی واضح اور روشن۔ **لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ** (ترجمہ:۔تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاوے) یعنی شرک سے ایمان کی طرف۔ **وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ** (ترجمہ:۔بے شک اللہ تم پر) یعنی تمہیں شرک سے توحید کی طرف نکال لیجاتے ہیں۔ **لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ**۔ (ترجمہ:۔بڑا شفیق بڑا مہربان ہے) یعنی کثیراً الرفۃ ہے حد درجہ نرمی فرمانے والا۔

(۱۰) **وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔اور تمہارے لئے کون سا سبب ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہو) یعنی اللہ کی اطاعت میں اس کی قربت کے حصول میں اور معنی یہ ہیں کہ کونسی شئے تمہیں ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی ہے۔ **وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (ترجمہ:۔حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث صرف اللہ کی ہے) یہاں ''وَ'' حالیہ ہے۔یعنی زمینوں اور آسمانوں کی میراث اللہ کی جانب لوٹتی ہے کیونکہ وہی ان کا مالک اور خالق ہے۔ **لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ** (ترجمہ:۔تم میں سے جو فتح مکہ سے پہلے خرچ کر چکے ہیں برابر نہیں ہے) یعنی فتح مکہ سے قبل۔ جمہور نے یہی کہا ہے کہ اور یہ اس لئے کہ فتح مکہ سے قبل لوگ زیادہ محتاج تھے انفاق کے بہ نسبت اس کے بعد۔ **وَقٰتَلَ** (ترجمہ:۔لڑ چکے ہیں) یعنی کفار سے فتح مکہ سے قبل اور یہ منافق اور اللہ کی راہ میں مقاتلین کے درجات کے فرق کو بیان کرنے کے لئے ہے پس جس نے خرچ کیا اور لڑا فتح مکہ سے قبل اللہ کے نزدیک افضل واکرم ہے۔پس جس نے اس کے بعد خرچ وقتال کیا جیسا کہ اللہ نے صراحت کردی ہے۔اور کہا ہے۔ **اُولٰٓئِكَ** (ترجمہ:۔وہ لوگ) یعنی مذکورہ صفات والے۔ **اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا** (ترجمہ:۔درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے (فتح مکہ) کے بعد خرچ کیا اور لڑے قتال کیا) کیونکہ جس نے فتح سے پہلے خرچ وقتال کیا وہ دونوں عمل غیرۃ اسلام اور اس کی قوت کے لئے کئے کیا جب کہ اس کی حد درجہ حاجت تھی اور وہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والے' سبقت لے جانے والے اولین لوگ تھے جو اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے متلاشی تھے۔اور اللہ اور اس کے رسول کے مددگار تھے اور یہی لوگ تو کھرے سچے (صادقون) تھے اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ وقتال کیا اور گروہ در گروہ ان لوگوں میں شامل ہوئے بلاشبہ یہ اس وقت ہوئے جبکہ اس کی حاجت کم تھی۔امام رازی نے اپنی تفسیر اور واحدی نے ''**البسیط**'' میں ذکر کیا ہے کہ بلاشبہ حضرت ابوبکرؓ پہلے آدمی تھے جنہوں نے اسلام میں قتال کیا ہے۔وجہ یہ ہے کہ حضرت علی ظہور اسلام کے آغاز میں بہت کم سن تھے اور اس وقت صاحب القتال نہیں تھے۔اور حضرت ابوبکرؓ اس وقت ایک بوڑھے آدمی تھے۔وہ اسلام کی حمایت تاحیات کرتے رہے۔حتٰی کہ اسی کی خاطر زخم شدید بھی لگے کہ موت کے قریب پہنچ گئے۔میں کہتا ہوں (قول مفسر علام) کہ ہوسکتا ہے واحدی اہل سیر ومغازی نہ رہے ہوں۔کیونکہ ابن ہشام وغیرہ نے جو اہل سیر اور مغازی میں سے تھے اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ وہ سب سے پہلا غزوہ جس میں رسول اللہؐ نے شرکت کی غزوہ ودان تھا جسے غزوہ الابواء بھی کہا جاتا ہے۔بنوضمرۃ نے اس میں صلح کرلی ان کا سردار مخشی بن عمرو الضمری تھا اور ان سے لڑائی نہیں ہوئی۔پھر سریۃ عبیدۃ ابن الحارث ہوا لیکن ان میں جنگ نہیں ہوئی پھر سریۃ حمزہ ہوا اس میں بھی قتال نہیں ہوا۔پھر غزوہ بوط ہوا ان میں بھی جنگ نہیں ہوئی۔پھر سریۃ سعد ابن ابی وقاص ہوا پھر غزوہ سفوان مذکور ہے جس میں کوئی قتال نہیں ہوا۔پھر سریہ عبداللہ بن جحش ہوا جس میں قلیل جنگ ہوئی اور اس میں ابوبکر صدیقؓ نے شرکت نہیں کی کیونکہ وہ رسول کی معیت میں تھے۔پھر غزوہ بدر الکبریٰ واقع ہوا جس میں حضرت علیؓ نے شرکت کی۔انہوں نے بہت سے قریش کے جنگجو سرداروں کو قتل کیا اور اسی طرح حضرت حمزہؓ نے اور عمرؓ نے العاص بن ہشام بن

المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم کو قتل کیا۔ اور ابوبکر صدیقؓ نے قتال نہیں کیا۔ جہاں تک مضاربہ ملاکمہ اور المصاہرہ کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق معروف معنوں میں قتال پر نہیں ہوتا۔ جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ حضرت علیؓ اول الاسلام میں صبی وصغیر تھے وہ صحیح ہے لیکن یہ قول اس امر میں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا کہ رسول اللہؐ اور مشرکین کے مابین ظہور اسلام کے آغاز میں کوئی قتال نہیں ہوا۔ بلکہ مکہ سے ہجرت کے بعد واقع ہوا جیسا کہ سیر ومغازی کی کتب سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس طرح ظہور اسلام کی ابتداء اور ہجرت سے قبل حضرت علیؓ نے کوئی قتال نہیں کیا۔ اسی طرح قتال ابی بکر صدیقؓ بھی ثابت نہیں ہے جہاں تک مدینہ کی طرف رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد کا معاملہ ہے پس اسلام توانا ہوا۔ اس کے اہل میں اضافہ ہوا۔ مشرکوں کے گلے گھونٹ دئے گئے اور وہ لڑنے کے لئے تیار ہوئے۔ جہاں تک افواج کی تدبیر اور عساکر کی تنظیم اور انتظام حُروب کا تعلق ہے اس میں اصل حضور پاک ؐ کی رائے ہے پھر اس شخص کی رائے جس سے آپ نے مشورہ فرمایا پس آپ نے جسے مشاورت کے لائق دیکھا اس سے مشاورت فرمائی۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ حضرت اسامہؓ جنگی معاملات میں بڑے دانا اور معاملہ فہم تھے اور لشکروں کی اصلاح کے معاملہ میں بڑے منظم تھے اسی لئے آپ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل لشکر کے ساتھ بھیجا ابوبکرؓ نے انہیں برقرار نہ رکھا اور حاصل کلام یہ ہے کہ واحدی نے جو کہا اور امام رازی جس پر صاد کیا وہ صحیح نہیں ہے۔ **وَكُلًّا** (ترجمہ:۔ سب سے) یعنی ہر ایک سے۔ **وَّعَدَاللّٰهُ** (ترجمہ:۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے) یعنی ٹھکانے کا۔ **الْحُسْنٰى** (ترجمہ:۔ نیک) اور وہ جنت ہے۔ جمہور نے کلا کو بالنصب (زبر کے ساتھ) پڑھا ہے مگر بالرفع (پیش کے ساتھ) بھی پڑھا گیا ہے۔ تاکہ یہ مبتداء ہو اور خبر مبتداء محذوف ہو۔ **وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ** (ترجمہ:۔ اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے) یعنی اس پر کوئی شئے پوشیدہ نہیں۔

(۱۱) **مَنْ ذَالَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ** (ترجمہ:۔ کون ہے جو اللہ کو قرض دے) یعنی اپنا مال اللہ کے راستے میں خرچ کرے۔ **قَرْضًا حَسَنًا** (ترجمہ:۔ ایک اچھا قرض) یعنی بغیر احسان جتائے اور بغیر دل آزاری کے۔ **فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ** (ترجمہ:۔ تو وہ اس کو دوگنا کردے گا اس کے واسطے) یعنی اللہ اسے اس کے انفاق پر ثواب عطا کرے گا۔ فیضعفہ بھی پڑھا گیا ہے اور بصرہ اور کوفہ کے قراء نے الف اور تخفیف عین کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ قراۃ متواترہ ہے دونوں قرائتوں کی صورت میں فعل تاکید مرفوع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اس کو مرفوع پڑھنا عطف کی وجہ سے ہے یا قطع کی وجہ سے ہے یا استیناف کی وجہ سے۔ عاصم نے اسے فاء کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے استفہام کے جواب پر۔ ابوعلی الفارسی نے کہا کہ سوال قرض پر نہیں وارد ہوتا بلکہ یہ سوال قرض کے فاعل پر وارد ہوتا ہے۔ یا فعل کو نصب دی گئی ہے فعل مستفہم کی وجہ سے یعنی بین السطور قابل فہم ہے۔ ابوحیان نے کہا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ نصب کا جب فعل مستفہم ہوا دوات اسمیہ کے ساتھ آنا جائز ہے۔ جیسے من یدعونی فاستجیب لہ اور این بیتک فازروک۔ **وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ** (ترجمہ:۔ اور اس کے لئے ہوگا عزت بھرا اجر) اور وہ جنت ہے۔

(۱۲) **يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ** (ترجمہ:۔ جس دن تو مومنوں اور مومنات کو دیکھے گا) یعنی وہ دن یاد کرو

جب تم مومن مرد اور مومن عورتوں کو دیکھو گے۔ **يَسْعٰى نُوْرُهُمْ** (ترجمہ:۔ان کے نور کو دوڑتے چلتے) یعنی ان کے ایمان اور ان کی توحید کا نور۔ **بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ** (ترجمہ:۔ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف) فراء نے کہا ہے کہ یعنی ان کے دائیں اطراف کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ جہات میں سے اشرف جہت ہے۔ **بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ** (ترجمہ:۔آج تمہیں خوشخبری ہے) یعنی ان سے فرشتے کہیں گے۔ **جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** (ترجمہ:۔باغات کی جن کے نیچے نہریں ہیں سدا رہیں گے اس میں یہی تو عظیم کامیابی ہے) اس کی قدر کو نہیں گھٹائے گا۔

(۱۳) **يَوْمَ** (ترجمہ:جس دن) یعنی یاد کرو وہ دن **يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا** (ترجمہ:۔منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گے کہ ہماری طرف دیکھو) فراء نے کہا کہ عرب کہتے ہیں **انظرنی** یعنی **انتصرنی** (یعنی میری مدد کر) اور جب کہا جاتا ہے کہ **نظرت فی الامر** کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں **تفکرت فیه و تدبرت بالنسب** **نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ** (ترجمہ:۔ہم نور سے اقتباس کریں) یعنی اس سے روشنی حاصل کریں۔ **قِيْلَ** (ترجمہ:۔کہا جائے گا) کہنے والے مومن ہوں گے یا فرشتے۔ **ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ** (ترجمہ:۔اپنے پیچھے لوٹ جاؤ) یعنی اس طرف جہاں سے ہم نے نور حاصل کیا ہے۔ **فَالْتَمِسُوْا** (ترجمہ:۔پس تلاش کرو) یعنی وہاں سے طلب کرو۔ **نُوْرًا** (ترجمہ:۔نور کو) اس سے روشنی حاصل کرو۔ نور سے مراد محمد رسول اللہؐ ہیں یہ ابن عباسؓ کا قول ہے۔ پس جب نور سے منور نہیں ہوں گے ہلاک ہو جائیں گے۔ اور کفر پر مریں گے۔ اور اس کی ظلمات میں غلطاں ہوں گے۔ **فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ** (ترجمہ:۔تو ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔) سور دو چیزوں کے درمیان رکاوٹ کو کہتے ہیں۔ یعنی ان کے اور جنت کے درمیان دیوار حائل کر دی جائے گی۔ **لَّهٗ** (ترجمہ:اس میں) یعنی اس دیوار میں۔ **بَابٌ بَاطِنُهٗ** (ترجمہ:۔دروازہ ہوگا اس کا باطن) یعنی اس دیوار کے اندر۔ **فِيْهِ الرَّحْمَةُ** (ترجمہ:۔اس میں راحت ہوگی) یعنی جنت ہوگی یا اللہ کی رحمت یا نور۔ **وَظَاهِرُهٗ** (ترجمہ:۔اور اس کے باہر) یعنی اس دیوار کے باہر۔ **مِنْ قِبَلِهِ** (ترجمہ:۔اس کی جانب) یعنی اس کے ظاہر کی جانب سے۔ **الْعَذَابُ** (ترجمہ:۔عذاب ہوگا) یعنی اندھیرا یا جہنم کا عذاب۔

(۱۴) **يُنَادُوْنَهُمْ** (ترجمہ:انہیں پکاریں گے) یعنی مومنوں کو (اس دیوار کے اس طرف سے) پکاریں گے۔ **اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ** (ترجمہ:۔کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے) یعنی منافق مومنوں سے کہیں گے کہ کیا دنیا میں ہم تمہارے موافق نہیں تھے ہم تمہارے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور تمہارے اعمال کی طرح عمل کرتے تھے۔ **قَالُوْا** (ترجمہ:۔وہ کہیں گے) یعنی مومن انہیں کہیں گے۔ **بَلٰى** (ترجمہ:۔کیوں نہیں) یعنی تم ہمارے اعمال کی طرح عمل کرتے تھے اور ظاہر میں تم ہمارے ساتھ تھے۔ **وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ** (ترجمہ:۔لیکن تم نے تو اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا) آزمائش میں ڈال لیا۔ **اَنْفُسَكُمْ** (ترجمہ:۔اپنے آپ کو) نفاق کے ذریعے **وَ تَرَبَّصْتُمْ** (ترجمہ:۔تم (ہمیشہ برائی کے) منتظر رہے) یعنی تم محمد رسولؐ پر حوادثِ دہر کے منتظر رہے۔ **وَارْتَبْتُمْ**

(ترجمہ:۔اور شک کرتے رہے) یعنی دین کے معاملے میں اور تم یقین نہیں رکھتے تھے۔**وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ**(ترجمہ:۔اور تمہاری جھوٹی آرزوؤں نے تمہیں دھوکے میں ڈالے رکھا) یعنی باطل تمناؤں نے تمہیں دھوکا دیا۔ **حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ**(ترجمہ:۔یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا) یعنی موت اور یہ ابن عباسؓ کا قول ہے۔**وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ**(ترجمہ:۔ دینے والے نے اللہ کے بارے میں تمہیں دھوکے میں ڈال دیا) اور اس سے مراد شیطان ہے اور یہ ابن عباسؓ کا قول ہے۔

(۱۵) **فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ**(ترجمہ:۔ اپس آج تم سے نہ لیا جائے گا۔) اے منافقو! **فِدْيَةٌ** **وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا**(ترجمہ:۔کوئی فدیہ اور نہ ہی ان سے جنہوں نے کفر کیا) ظاہری طور پر اور باطنی طور پر **مَاْوٰكُمُ**(ترجمہ:۔تمہارا ٹھکانہ ہوگا) یعنی تمہاری منزل۔ **النَّارُ**(ترجمہ:۔آگ) یعنی آتش دوزخ **هِيَ مَوْلٰكُمْ** (ترجمہ:۔وہی تمہارے لائق ہے) یعنی تمہارے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے۔مولیٰ اسے کہتے ہیں جو انسانی فوائد کا متولی ہو۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ **مولیٰ** کا لفظ کئی معانی کے لئے آیا ہے۔اس میں ایک معنی ولی ہے جیسے کہ اللہ نے فرمایا۔**بان الله مولیٰ الذين امنو ا وان الكافرين لا مولیٰ لهم**(محمد ۱۱) یعنی لا ولیٰ" **لهم**۔اسی طرح حدیث میں آیا ہے **ايّما امراء ة نكحت بغير اذن مولاها فنكاحها باطل** یعنی آپ نے فرمایا" جس عورت نے بھی اپنے مولیٰ کے اذن کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے"۔اس میں مولیٰ سے مراد ولی ہے۔اس طرح آپؐ کا فرمانا ہے **من كنت مولاه وفعلى مولاه**(جس کا میں ولی ہوں علی بھی اس کا ولی ہے) صاحب لسان نے کہا کہ اس کے معنی یہی ہیں دوسرے اس کے معنی حلیف ہیں اور اس معنی میں بنو خصفة کے عامر خصفی کا یہ قول ہے۔

**هم المولیٰ وان جنفوا علينا وانّا من لقاء هم كزور**

نیز اس کے معنی چچازاد بھائی اور بھانجے کے ہیں۔ابن الاعرابی کا یہی قول ہے۔اس معنی میں جعدی کا یہ قول ہے۔

**موالى حلف ولا موالى قرابة ولاكن قطيناً يسئلون الا تاويا**

یعنی وہ قرابت دار" ولی" نہیں ہیں حلف والے ولی ہیں۔اور اس کے معنی مناسب جگہ کے بھی ہیں۔اس معنی میں لبید بن ربیعہ کا یہ قول ہے۔

**فغدت كلا الفرجين تحسب انه مولى المخافة خلفها وامامها**

اس شعر میں **مولی المخافة** سے اس کی مراد جنگ کا مناسب مقام ہے۔یہی معنی اس مقام پر مناسب ہیں یعنی جہنم کی آگ ان کے لئے بہت ہی مناسب مقام ہوگا۔**وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ**(ترجمہ:۔اور کتنا برا ٹھکانہ ہے) یعنی لوٹنے کی جگہ (مرجع)

(۱۶) **اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا** (ترجمہ:۔کیا ابھی وقت نہیں آیا اہل ایمان کے لئے) کہا جاتا ہے۔ **انى الشئى يانى انياً** اور **اِنًى** بمعنی **حان** وقت کا قریب آنا اور (ادراک) پہونچنا۔فراء اور الزجاج نے بھی یہی کہا ہے جمہور نے **الم يانِ** پڑھا ہے۔ **الّما يانِ** بھی پڑھا ہے۔جس کے معنی ہیں کیا وقت نہیں آیا۔ **اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ**(ترجمہ:۔کہ اللہ کے ذکر سے

قلوب نرم پڑ جائیں) اور خشوع یعنی قلب کی نرمی اور رقّت۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کے ایک گروہ کے پاس رسول اللہؐ مسجد میں آئے اور وہ ہنسی مذاق کر رہے تھے پس آپ کا چہرہ فرط غضب سے سرخ ہو گیا۔ اور آپ نے کہا کیا تم ہنسی مذاق کر رہے ہو جبکہ تمہارے رب کی طرف سے امان نہیں پہنچی ہے کہ اس نے تمہیں معاف فرما دیا ہے اور اللہ نے تمہاری چہل بازی (ہنسی مذاق) پر مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کا کفارہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جتنا ہنسے ہو اسی قدر رو۔ **وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ** (ترجمہ:۔ اور جو کچھ حق (میں) سے اس نے اتارا) یعنی قرآن کریم۔ **وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ** (ترجمہ:۔ اور وہ نہ ہو جائیں ان لوگوں کی طرح جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی) جمہور نے ''یکونوا'' (بالتحتانیۃ) اور خطاباً بھی پڑھا ہے التفات کے انداز میں۔ **فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ** (ترجمہ:۔ ایک طویل مدت ان پر گذر گئی) یعنی ایک طویل زمانہ۔ **فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ** (ترجمہ:۔ پس ان کے قلوب سخت ہو گئے) اللہ نے ان پر جو نازل کیا تھا اس میں انہوں نے تحریف کر دی۔ **وَكَثِيْرٌ'' مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ** (ترجمہ:۔ اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمانبردار ہو گئے) یعنی اللہ کی اطاعت سے باز آ گئے۔

(۱۷) **اِعْلَمُوْٓا** (ترجمہ:۔ جان لو) یہ مومنوں سے خطاب ہے **اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** (ترجمہ:۔ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے) یعنی بارش کے ذریعہ زمین میں نباتات پیدا کرتا ہے اسی طرح اللہ قلوب کو ذکر اور تلاوت قرآن سے زندہ کرتا ہے۔ **قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (ترجمہ:۔ ہم نے تمہارے لئے (آیات) نشانیوں کو صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ تاکہ تم سمجھ لو۔) یعنی آیات کے معنی کو پس دونوں جہاں کی سعادت حاصل کر کے کامران ہو جاؤ۔

(۱۸) **اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ** (ترجمہ:۔ بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں) یعنی متصدقین اور متصدقات۔ تصدیق میں تخفیف صاد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کو سچا **مانا وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** (ترجمہ:۔ اور انہوں نے اللہ کو قرض حسنہ دیا) کہا جاتا ہے کہ عطف صلہ پر ہے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ کو سچا مانا اور اللہ کو بہترین قرض دیا۔ قرض حسنہ سے مراد انفاق فی سبیل اللہ) یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ ورنہ عاقل سمجھتا ہے کہ اللہ بلاشبہ غنی ہے۔ وہ قرض کا محتاج نہیں ہے اور اس میں یعنی اس انفاق میں اختلاف ہے۔ کچھ نے کہا اس سے مراد انفاق واجب ہے۔ زکوٰۃ و صدقہ فطر اور بعض نے کہا اس سے مراد واجب کے علاوہ ہے اور مراد اس سے تطوع ہے۔ یعنی نفلی صدقہ پھر انفاق عمدہ ہو نہیں سکتا سوائے اس شرط کے کہ اولاً وہ حلال ہو دوم پاکیزہ مال میں سے ہو اور پسندیدہ اشیاء میں سے ہو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ''لن تنالو البر حتی تنفقوا مما تحبون'' (آل عمران ۹۲) اور فرمایا ''ولا تیمو الخبیث منہ تنفقون'' (البقرۃ ۲۶۷) سوم یہ کہ جس پر خرچ کیا جائے وہ محتاج ہو۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ یطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً ویتیماً واسیرا (الانسان ۸) اور چہارم یہ کہ اس میں نہ احسان جتانا ہو اور نہ ہی دل آزاری اور پنجم یہ کہ اس کا اخفاء ہو جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ وان تخفوھا وتوتوھا

بالفقراء۔(البقرۃ ۲۷۱) اور ششم یہ کہ اللہ کی مرضی حاصل کرنے کی خاطر ہوا اور ہفتم یہ کہ دینے والے کی نظروں میں دیا جانے والا مال حقیر جانو۔ امام رازی نے بھی یہی کہا ہے اور میرے نزدیک بھی صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ انفاق ہے جو زکواۃ اور صدقہ فطر کے علاوہ ہو۔ **يُضٰعَفُ لَهُمْ** (ترجمہ:۔اس کو ان کے لئے دوگنا کر دیا جائے گا) جواب استفہام کے طور پر نصب کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا کوئی اللہ کو قرض دے گا' تو وہ فیضایفہ یعنی اللہ اس کو اس کا اجر دگنا دے گا۔ ابن کثیر وابن عامر نے تشدید کے ساتھ بغیر الف فیضعّفه پڑھا ہے۔ اور عاصم نے فیضاعفه الف کے ساتھ ''فا'' پر زبر پڑھا ہے۔ ابوعمرو البصری ونافع حمزہ اور کسائی نے فیضاعفه الف کے ساتھ اور ''فا'' پر پیش پڑھا ہے۔ اہل لغۃ اور ابوعلی فارسی نے کہا یضاعف اور یضعّف کے ایک ہی معنی ہیں سب سے زیادہ صحیح وجہ نصب ہے۔ **وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ** (ترجمہ:۔اور ان کے لئے خوب عزت والا اجر ہوگا) وہ جنت ہوگی۔

(۱۹) **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ**

(ترجمہ:۔اور وہ لوگ جو اللہ اور رسول پر ایمان لائیں۔ صدیق' شہداء ہیں ان کے رب کے پاس) مجاہد' فراء اور زجاج نے کہا کہ یہ آیت خاص طور پر شہداء کے لئے ہے۔ اور وہ انبیاء ہیں جو امتوں پر اور ان کے لئے شہادت دیں گے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں شہید کئے جاتے ہیں۔ **لَهُمْ اَجْرُهُمْ** (ترجمہ:۔ان کے لئے ان کا اجر ہوگا) یعنی ان کا ثواب۔ **وَنُوْرُهُمْ** (ترجمہ:۔اور ان کا نور ہوگا) یعنی وہ نور جس کا وعدہ کیا گیا ہے کہ عطاء کیا جائے گا۔ **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ** (ترجمہ:۔اور وہ لوگ جنہوں نے کفر (اختیار) کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا) کفر وتکذیب دونوں ایک ہی چیز ہیں جو دوزخ کے داخل ہونے کی موجب ہوں تو کیسا ہوگا۔ جو کوئی ان دونوں کو اپنے درمیان جمع کرے گا پس وہ دوزخ میں آباد کئے جانے کا مستحق ہوگا۔ **اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ** (ترجمہ:۔یہی وہ لوگ دوزخی ہیں) پس انہیں عذاب دیا جائے گا۔

(۲۰) **اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ** (ترجمہ:۔جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل تماشہ ہے) بچوں کے کھیل کود کی طرح اور جوانوں کے اشغال وتفریحات کی طرح۔ مجاہد نے کہا ہر کھیل لہو ہے۔ صاحب اللسان نے ذکر کیا ہے کہ اہل تفسیر کے نزدیک حضر الموت کی لغت میں لہو کے معنی ہیں الولد (لڑکا) اور کہا جاتا ہے کہ اللهو یعنی عورت اور کہا لهو جماع کا کنایہ ہے۔ **وَّزِيْنَةٌ** (ترجمہ:۔اور زیب وزینت ہے) دنیا کے ساز وسامان کی تزئین (سجاوٹ) **وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ** (ترجمہ:۔اور آپس میں ایک دوسرے پر تفاخر ہے) اور اضافۃ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اور تفاخر' اشیاء' مال' جمال' قوۃ وحسب ونسب اور عزیمت اور نیک اولاد سے ہوتا ہے۔ **وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ** (ترجمہ:۔اور اموال اور اولاد کی کثرت کا ایک دوسرے پر زیادتی) اور یہ تمام اشیاء فانی ہیں۔ کیونکہ مال میں دوسرے کی طرف جانے کا میلان ہے۔ اور جمال زمانے کے گذرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور قوۃ بڑھاپے میں باقی نہیں رہتی۔ اور نسب کا تعلق غیر سے ہوتا ہے۔ اور الحسب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس نے اپنے آباء کی مفاخرۃ کی پس وہ غیر (دوسرے) کی صفات میں سے ہے۔ نیک عمل ہے جو نفس (جان) کی طرف رجوع کرتا ہے جو کہ اللہ کی تخلیق کردہ ہے۔ اسی طرح

عزیمت بھی نفس کی طرف لوٹتی ہے۔ ولد اللہ کی مخلوق ہے۔ پس عاقل کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا کہ اس پر فخر کرے۔ اور حضرت علیؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے عمار بن یاسرؓ سے فرمایا دنیا کا ملال نہ کر' دنیا چھ چیزوں کا نام ہے۔ ماکول ومشروب وملبوس وشموم ومرکوب ومنکوح کھانا پینا' لباس' خوشبو' سواری' اور زوج پس اس کا سب سے عمدہ طعام شہد ہے اور وہ مکھی کا لعاب اور اس کے بیشتر مشروب پانی ہیں اور اس میں کل حیوان مساوی ہیں۔ اور اس کے ملبوسات میں دیباج افضل ہے اور وہ ریشم کے کیڑے کے بُنائی اور اس کی خوشبوؤں میں مشک افضل ہے اور وہ ہرن کا خون ہے۔ اور افضل سواری گھوڑا ہے جس پر لوگ سوار ہو کر لڑتے ہیں۔ اور جہاں تک منکوح کا تعلق ہے وہ عورتیں ہیں اور جو مستقل جھگڑا در جھگڑا ہیں۔ پس یہ حیاتِ دنیا کے احوال کی شرح ہے اور یہ وہ حقیر اشیاء ہیں جن کی طرف عقلاء رخ نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ اس سے اطمینان حاصل کریں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جلدی ختم ہونے والی بھی ہیں اور مضمحل ہونے والی بھی ہیں ان کی مثال۔ **كَمَثَلِ غَيْثٍ** (ترجمہ:۔ بادل کی طرح ہے) اہل لغۃ کے قول میں یہ بارش اور سبزہ ہے۔ بارش سے اگنے والی ہر شئے کو کہا جاتا ہے۔ اور اس کی جمع اغیاث ہے یہاں اس کے معنی بارش ہیں **اَعْجَبَ الْكُفَّارَ** (ترجمہ:۔ کاشتکار کو نہال کر دیا) یعنی زراع (کاشتکار)۔ کہا جاتا ہے ہر وہ شخص جس نے کوئی شئے چھپائی پس اس نے کفر کیا۔ **فقد كفره و كَفَّرَه** اور کافر کسان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ مٹی میں بیج کو ڈھانپتا ہے۔ اسی نسب سے **كافر الليل** کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ظلمت سے ہر شئے کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسی سے لبید کا قول ہے۔ **فی ليلة كفر النجوم غمامها** (رات میں ستاروں کو اس کی اندھیری نے چھپا دیا) **نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيْجُ** (ترجمہ:۔ اس کی سبزی نے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے) یعنی سرسبز ہو جانے کے بعد وہ خشک ہو کر زرد ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے **هاج البقل هياجاً فهو هائج** یعنی سبزی سوکھ گئی اور زرد ہو گئی "**ارض هائجة**" بھی کہا جاتا ہے جس زمین کی کاشت سوکھ گئی ہو یا زرد پڑ گئی ہو۔ اور حدیث میں ہے **تصرعنها مرّة وتعد لها مرّة اخرى حتى تهيج** اور حدیث میں ہے ہم رسول اللہؐ کے ساتھ تھے آپ نے ٹہنیوں کے لئے حکم دیا جنہیں کاٹا گیا یا وہ کٹی ہوئی خشک تھیں۔ **فَتَرَهُ مُصْفَرًّا** (ترجمہ:۔ پھر تم اُسے پیلا دیکھو گے) تبدیل شدہ۔ **ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا** (ترجمہ:۔ پھر وہ ہو جائے گی ریزہ ریزہ) یعنی ٹوٹی ہوئی چورہ چورہ۔ **وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ** (ترجمہ:۔ اور آخرۃ میں شدید عذاب ہوگا اور اللہ کی مغفرہ اور رضامندی ہوگی فراء نے کہا ہے کہ اس آیت میں تقدیر عبارت یہ ہے کہ یا تو شدید عذاب ہوگا یا پھر مغفرۃ۔ شدید پر وقف جائز نہیں۔ **وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ** (ترجمہ:۔ دنیا کی زندگی صرف دھوکہ کا سامان ہے) یعنی اس کے لئے جو آخرۃ کی طلب میں سرگرداں نہیں ہے۔

(۲۱) **سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ** (ترجمہ:۔ اپنے پروردگار کی مغفرۃ کے لئے مسابقت کرو) یعنی اپنے رب کی مغفرۃ کے لئے نیک اعمال کے ذریعہ مسابقت کرو اور اس کی سرکار میں پشیمان ونادم ہو۔ **وَجَنَّةٍ** (ترجمہ:۔ اور جنت کی طرف) یعنی جنت کی طرف مسابقت۔ **عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ** (ترجمہ:۔ اس کا عرض آسمان وزمین کی وسعت کی طرح ہے) اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فلک محدود کے علاوہ وسیع جگہ ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ جنات تمام کی تمام عالم قدس میں ہیں اور وہ

عالم جسمانی سے اوپر ہے اور اس مسئلہ کو سورۃ البقرۃ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں۔ **اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ** (ترجمہ:۔ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہیں یہ) یعنی جس کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ **فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ** (ترجمہ:۔اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے) اور فضل عمل پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا دار ومدار رحمت اور مہربانی پر ہے۔ **وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ** (ترجمہ:۔اور اللہ زبردست فضل والا ہے) ہواپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے مہربانی کرتا ہے۔

(۲۲) **مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ** (ترجمہ:۔کوئی مصیبت زمین پر نازل نہیں ہوتی) بارش کے قحط اور زلزلہ کی۔ **وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ** (ترجمہ:۔ اور نہ ہی تمہارے نفوس میں) امراض اور اولاد کی موت کی۔ **اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ** (ترجمہ:۔سوائے اس کے کہ وہ کتاب میں (درج) ہے) یعنی لوحِ محفوظ میں ہے۔ **مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا** (ترجمہ:۔اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں) یعنی ہم ان کو یعنی حوادثِ زمینی اور نفسی کو تخلیق کریں۔ **اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ** (ترجمہ:۔بے شک یہ اللہ پر آسان ہے) یعنی ان اشیاء کی تقدیر۔یسیر یعنی اللہ کے لئے آسان ہے۔اور ہم نے اس لئے ان کی خبر کر دی ہے۔

(۲۳) **لِّكَيْلَا تَاْسَوْا** (ترجمہ:۔تاکہ تم غمگین نہ ہو) یعنی تمہیں حزن وملال نہ ہو۔ **عَلٰى مَافَاتَكُمْ** (ترجمہ:۔اس پر جو تم سے جاتا رہا) دنیاوی ساز وسامان میں سے اس کی مرغوبات اس کی قیمتی اشیاء اس کے چمک دمک یا عافیت وصحت میں ہے۔ **وَلَا تَفْرَحُوْا** (ترجمہ:۔اور نہ اتراؤ) اس کی فائدہ بخش اشیاء اور اجناس پر۔ **بِمَآ اٰتٰكُمْ** (ترجمہ:۔جو تم کو اس نے عطاء کیا ہے) قصر کے ساتھ اسے "اتاکم" بھی پڑھا جاتا ہے لیکن جمہور نے مدّ کے ساتھ "آتاکم" پڑھا ہے یعنی اللہ نے تمہیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے۔ پس یہ آناً فاناً زائل ہونے والا ہے۔پس عقل مند زائل ہونے والی اشیاء پر مائل نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس پر خوش ہو۔پس جب زائل ہو جاتی ہے وہ چیز جس پر خوش ہوا جاتا ہے تو انسان محزون وملول ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس کے ارادے کے خلاف صادر ہوا ہوتا ہے۔حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اے ابن آدم تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو مفقود چیز پر تاسف کرتا ہے جس کا فوت ہونا اسے تیری طرف لا نہیں سکتا۔اور کیا ہو گیا کہ تو موجود چیز پر اکڑتا ہے جسے موت تیرے ہاتھ میں نہیں چھوڑے گی۔اور اس میں اصل بات ہے انسان کے علم میں اس کے ضد کی صورت منقلب ہونا۔اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کو کسی بھی چیز کے فوت ہونے پر محزون ومغموم نہیں ہونا چاہئے۔اور نہ ہی کسی چیز کے وجود پر اتراتا اور خوش ہونا چاہئے۔ بلکہ ہر حال میں اس کی قضاء وتقدیر پر راضی رہنا چاہئے۔ **وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ** (ترجمہ:۔اللہ فخر کرنے والے متکبر، خود فریب وگمراہ کو پسند نہیں کرتا۔) اختیال یعنی افتخار اور فخور وہ ہوتا ہے جو لوگوں کو حقارت سے دیکھتا ہے۔"یحب" کے معنی ہیں "یرضی" یعنی اللہ ہر اس متکبر سے راضی نہیں ہوتا جو لوگوں کو حقارت سے دیکھتا ہے۔

(۲۴) **الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ** (ترجمہ:۔یہ وہ لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں) یعنی اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ہیں۔کہا

جاتا ہے کل مختال سے بدل ہے یا اغنی مقدر ہے پس وہ منصوب ہوگی اور یہ بھی جائز ہے کہ کل مختال کی یہ صفت موضع نصب پر ہے۔ یا مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ جس کی تقدیر ہے ھم الذین. **وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ** (ترجمہ:۔ اور وہ لوگوں کو بخل کی تلقین کرتا ہے) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا اور اس کے ساز وسامان کو فضیلت دی۔ دنیا ان کی نگاہوں میں سج دھج والی بن گئی اور اس کی مرغوبات ان کے نزدیک عظیم بن گئیں پس وہ بخل کرتے ہیں کہ اللہ کے حقوق ادا کریں۔ اور اپنے بخل پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ لوگوں کو بخل پر اُکساتے ہیں اور اس معاملہ میں ان کے قائد ہیں۔ **وَمَنْ يَّتَوَلَّ** (ترجمہ:۔ اور جو کوئی پھرا ہے) اس سے جس کا اللہ نے حکم دیا۔ **فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ** (ترجمہ:۔ پس اللہ بلاشبہ بے نیاز قابل ستائش ہے) اور تولیٰ کے معنی اعراض ہیں۔ جمہور نے " فان الله هو " پڑھا ہے۔ اور نافع وابن عامر نے "هو" کے بغیر۔ ابوحیان نے کہا کہ اس طرح مدینہ اور شام کے مصاحف میں ہے اور دونوں قراءتیں متواترہ ہیں۔ بعض اہل نحو نے کہا جس میں ابوعلی فارسی بھی شامل ہیں کہ فصل مستحسن ہے۔ یعنی هو کو حسن سمجھتے ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ دونوں ہی مستحسن ومتواتر ہیں لہذا ابوعلی الفارسی کی بات کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ (اور یقین رکھنا چاہئے کہ اللہ نے جو مقدر کر دیا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ کیونکہ وہ ایسی کتاب میں ثابت ہو چکا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اس طرف نبی پاک ؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب کسی نے تقدیر اللہ کے راز کو پہچان لیا اس پر مصیبتیں آسان ہو جاتی ہیں۔)

(۲۵) **لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا** (ترجمہ:۔ ہم نے واقعی اپنے رسول بھیجے) لام قسم کا ہے' ابوحیان نے کہا رسل سے مراد بنو آدم کے رسول ہیں۔ **بِالْبَيِّنٰتِ** (ترجمہ:۔ روشن دلیلوں کے ساتھ) یعنی براہین اور معجزات کے ساتھ۔ **وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ** (ترجمہ:۔ اور ان کے ہمراہ ہم نے کتاب نازل کی) معھم حال مقدرہ ہے یعنی ہم نے کتاب اتاری اس حال میں کہ وہ ان کے ساتھ تھی۔ اور زمخشری نے کہا کہ رسولوں سے مراد ملائکہ ہیں اور معنی مقدرہ یہ ہیں بے شک ہم نے ملائکہ بھیجے انبیاء علیہ السلام کی طرف دلائل ومعجزات کے ساتھ اور ان کے ساتھ اتاری وحی۔ اور میرے نزدیک یہ ابی حیان کے قول سے زیادہ واضح ہے کیونکہ اس قول سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمخشری کی تاویل بشر کی رسالت کے انکار کا سبب بنتی ہے۔ **وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (ترجمہ:۔ اور میزان تاکہ لوگ عدل پر قائم رہ سکیں) جمہور نے کہا کہ میزان سے مراد عدل ہے۔ یہ ایک واضح دلیل ہے کہ عدل کو عقل انسانی سمجھ نہیں سکتی چہ جائیکہ اسے قائم رکھے۔ کیونکہ اس کی معرفت' معرفت وسط پر موقوف ہے اور اس کی معرفتہ نے عقل کے نزدیک مشکل اشیاء کے دونوں اطراف واضح کر دیا۔ پس میزان یعنی عدل پر قائم رہنا عقل کے نزدیک مشکل ہے اسی لئے اللہ نے میزان کے اصول وفروع اپنی کتاب میں نازل فرمائے۔ اور وہ اپنے رسول کریم ﷺ کو اس کی معرفت عطا کی۔ قولہ تعالیٰ **يعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين** (آل عمران ۱۶۴) میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اور کتاب سے مراد شرائع ہیں اور حکمۃ سے عدالتہ مراد ہے۔ پس جس طرح انبیاء علیہم السلام لوگوں کو شرائع کی تعلیم دیتے ہیں اسی طرح معدلۃ کے اصول اور اس کے قوانین کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اسی لئے حکماء میں سے بعض اللہ والوں نے کہا کہ اصول حکمۃ اور اس کی فروعات کی کان نبوۃ ہے یہ اس لئے کہ انسانی عقل انسانی فطرت

کے لئے ضروری مطلوبہ تمام چیزوں کی اصلاح پر قادر نہیں ہوسکتی۔ **وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (ترجمہ:۔ہم نے لوہے کو اتارا۔اس میں شدید سختی (قوۃ) ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہے) قطرب نے کہا ہے کہ انزلنا یعنی ہم نے اسے تیار کیا۔ یہ "نزل" سے ہے۔کہا جاتا ہے "**انزل الامیر علی فلان نزلاً حسنا**. اور انزال کے معنی انشاء بھی ہیں جیسے کہ اللہ نے فرمایا **وانزل لکم من الانعام ثمانیه ازواج** (الزمر ٦)۔کہتے ہیں کہ جہاں والوں کے فوائد بہ نسبت دوسری چیزوں کے لوہے میں زیادہ ہیں اس لئے کہ مصالح عالم کے اصول چار ہیں، زراعۃ' حیاکۃ' خیاطۃ اور گھروں کی بناوٹ اور سلطنت۔ جہاں تک زراعت کا تعلق ہے اس کے لئے لوہے کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اراضی کا جوتنا اور کھودنا اس کے بغیر ممکن نہیں۔اور حیاکت اس کے لئے آلات کا ہونا ضروری ہے جو اکثر لوہے سے بنے ہوتے ہیں۔اسی طرح خیاطۃ ہے اور گھروں کی تعمیر میں بھی لوہے کا ہونا ضروری ہے۔مثال کے طور پر لکڑی کو لکڑی سے ملانا ہے البتہ سلطنت کی اسباب میں سے آلاتِ حرب اور قلعوں اور ان کے دروازوں وغیرہ کی بناوٹ شامل ہے۔پس اسمیں بھی لوہے کا ہونا ضروری ہے۔اور کثیر المنافع کے ساتھ ساتھ قیمت میں سستا بھی ہے اور اس کی کانیں بہ نسبت دوسری چیزوں کے زیادہ بھی ہیں۔ **وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ** (ترجمہ:۔اور تا کہ اللہ معلوم کرے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں) یعنی اللہ ظاہر کرنا چاہے کہ کون اس کے دین اور رسولوں کی مدد کرتے ہیں تلوار' تیر اور سارے آلات حرب کے ساتھ کفار سے جہاد وقتال کے وقت جب وہ ان پر غالب آتے ہیں یا اس کے دین کی اہانت کرنا چاہتے ہیں۔**ولیعلم اللہ** میں واؤ عطف کا ہے اس کا عطف **لیقوم الناس بالقسط** پر ہے۔اور یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ جہاد کے ذریعہ ان کی مدد کرنا دلائل کے وضاحت وقیام حجت کے بعد لازمی ہے۔جیسا کے رسول اللہؐ کے مکہ میں تیرہ سال قیام اور لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے اور اللہ کی توحید پر دلالت کرنے والے براہین ودلائل کو واضح کرنے اور قرآن کے نازل ہونے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کی اور قتال کے لئے اذن الٰہی کے ساتھ مستعد رہے۔پس اللہ نے کفار ومشرکین کی گردنیں ماریں اور انہیں غمگین کر دیا۔یہ جمہور کا قول ہے۔ **بِالْغَيْبِ** (ترجمہ:۔غیب میں رہتے ہوئے) یعنی اس حال میں کہ غائب ہوں اس طور پر جیسے کہ وہ اس کی مدد نہیں کر رہے ہوں۔ابن عباسؓ نے کہا وہ اس کی مدد کرتے ہوں اور اسے دیکھتے نہ ہوں اور اسی سے اللہ کا قول ہے **ان تنصرو اللہ ینصر کم** (اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا) . **اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ** (ترجمہ:۔بلاشبہ اللہ قوی ہے' زبردست) یعنی اللہ ہر شئے پر قادر ہے' کلمۃ اسلام کو بلند کرنے میں اور اپنے دین کو ظاہر کرنے میں مومنوں سے کسی ایک کا بھی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ بلاشبہ اسی نے جہاد وقتال کی انہیں ہدایت بخشی تا کہ درجہ الشہادہ کو پائیں اور اللہ کا دین بلند ہو اور عظیم کامیابی سے سرفراز ہوں۔

(٢٦) **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ** (ترجمہ:۔بلاشبہ ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا) قسم کی تکرار تو کید کے لئے اور حکم سے اعتناء کے لے ہے۔ جہاں تک خصوصی طور پر ان دو کے بیان کا تعلق ہے ابوحیان نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ حضرت نوح کو جو کوئی

بھی کرہ ارض پر تھا اس کی طرف بھیجا گیا۔ اور یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن اس بات کی رہنمائی کرتا ہے کہ نوحؑ کو اللہ نے ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا کہ وہ ان کو ڈرائیں اس سے پہلے کہ **عذاب الیم** ان پر نازل ہو۔ جیسا کہ سورۃ نوح میں اللہ نے فرمایا **انا ارسلنا نوحاً الی قومه ان انذر قومک من قبل ان یا تیهم عذاب الیم** (نوح ۱) پھر فرمایا **یا قوم انی لکم نذیر مبین**(نوح ۲) اور سورہ الاعراف میں فرمایا **لقد ارسلنا نوحا الی قومه فقال یا قوم اعبدوا ما لکم من اله غیره**(الاعراف ۵۹) وسورہ ہود میں فرمایا **ولقد ارسلنا نوحا الی قومه انی لکم نذیر مبین ان لاتعبدوا الا الله**۔(ھود۲۵) پس یہ آیات اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ بلاشبہ نوحؑ کو اللہ نے ان کی قوم کی طرف بھیجا اور ان کی قوم اس وقت ایک شہر آلان میں تھی اور اس شہر کے اردگرد پہاڑ تھے جن سے دریا اور چشمے نکلتے تھے جیسا کہ مورخین نے کہا اور حاصل کلام یہ ہے کہ نوحؑ کو تمام اہل ارض کی طرف نہیں بھیجا گیا بلکہ صرف ان کی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ اور دعوت عام اور تمام انسانوں کی طرف بعثت رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا **وما ارسلنک الا کافة للناس** (سبا۲۸) ہم نے آپ کو کل انسانوں کے لئے بھیجا ہے اور فرمایا **وما ارسلنک رحمة للعالمین** (الانبیاء۱۰۷) ہم نے آپ کو کل عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ نبیؐ نے فرمایا بلاشبہ مجھے احمر واسود کی طرف بھیجا گیا۔ اور صحیح یہ ہے کہ سیدنا نوحؑ بشر کے بابائے ثانی ہیں اور سیدنا ابراہیم ابوالعرب ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابوالروم بنی اسرائیل ہیں اور اسی وجہ سے ان دونوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ **وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا** (ترجمہ:۔ اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں کردی) یعنی نوح اور ابراہیم علیہما الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں۔ **النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ** (ترجمہ:۔ نبوت اور کتاب) یعنی نازل کی ہوئی چاروں کتب تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید۔ **فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ** (ترجمہ:۔ پس ان میں کچھ ہدایت پانے والے ہیں) پس ان کی اولاد میں کچھ ہیں جنہیں ہدایت ملی انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کے ذریعہ۔ **وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ** (ترجمہ:۔ اور ان کی اکثریت فاسق ہیں) یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل جانے والے ہیں اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جنہوں نے ہدایت پائی اور اللہ پر ایمان لائے ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے۔ اور جو اللہ کی اطاعت سے نکل گئے اور فاسق تھے ان کی تعداد کثیر ہے۔ یہی مشیت الٰہی کی راہ ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا **ولو شاء ربک لا من من فی الارض کلهم جمیعا**(یونس۹۹) (اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین پر رہنے والے سب کے سب ایمان لے آتے)۔ پس جب مشیت تمام انسانوں کے ایمان لانے پر جاری نہیں ہوئی بلکہ ان میں سے بعض کے ایمان لانے پر ہی جاری ہوئی تو باقی ان میں سے اکثر فاسق لوگ رہ گئے۔ اور یہی حکم ہر دور میں ثابت رہا ہے جس نے بھی اللہ کی طرف بلایا تو اہل ایمان وہدایت والے اہل کفر وضلال سے کم ہی رہے۔

(۲۷) **ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ** (ترجمہ:۔ پھر ہم نے بھیجا ان کے نقش قدم پر) یعنی ہم نے ان دونوں کی اولاد میں سے سابقہ نبیوں کے نقش قدم مبعوث فرمائے۔ **بِرُسُلِنَا** (ترجمہ:۔ اپنے رسولوں کو) مثلاً موسیٰ والیاس، داؤد، سلیمان علیہم السلام اور وہ

جنہوں نے ان کی پیروی کی مثلاً ہارون ویوشع علیہما السلام۔ **وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ** (ترجمہ:۔ہم ان کے پیچھے لائے عیسیٰ بن مریم) یعنی رسول کے بعد رسول' یکے بعد دیگرے ہم بھیجتے رہے یہاں تک عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر انتہا ہوئی اور وہ بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں اور ان کی ماں ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھیں۔جیسا کہ مورخین نے ذکر کیا۔ **وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ** (ترجمہ:۔اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی) یہ وہ کتاب ہے جو اللہ نے ان پر نازل کی۔ابن جنی نے کہا ہے کہ حسن نے اسے (**واتیناہ الانجیل**) ہمزہ پر زبر کے ساتھ پڑھا ہے یہ وہ مثال ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔کیونکہ یہ افعیل کے وزن پر ہے اور یہ ان کے نزدیک "**نجلت الشئی**" کے قول سے لیا گیا ہے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب آپ کسی چیز کو کسی سے استخراج کریں یہ اس لئے کہ اس انجیل کے ذریعہ احکامات نکالے جاتے ہیں۔) اصمعی نے کہا ہے کہ **انجل ماء یسننجل من الارض** کے معنی ہیں **یستخرج** (نکلتا ہے یا نکالنے کا مطالبہ کرتا ہے) یہ ان کے قول کے مطابق ہے جو کہتے ہیں کہ یہ انجیل مشتق ہے **النجل** سے اور وہ فعل سے افعیل کے وزن پر ہے' اکلیل' اخریط کی طرح۔زجاج نے کہا ہے کہ یہ عجمی اسم بھی کہا جاسکتا ہے۔جس کی وجہ سے ھمزہ کے زبر کے ساتھ کو واضح ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بہت ساری عجمی مثالیں ہیں جو عربی مثالوں کے مخالف ہیں مثلاً آجر' ابراہیم' ہابیل' قابیل' انجیل' مذکر' مونث دونوں طرح مستعمل ہے جو لوگ اسے مونث مانتے ہیں۔اس سے ان کی مراد صحیفہ ہوتی ہے اور جو لوگ اسے مذکر مانتے ہیں ان کی اس سے مراد کتاب ہوتی ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عبرانی یا سریانی زبان کا اسم ہے۔ **وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ** (ترجمہ:۔ہم نے ان کی پیروی کرنے والوں کے دلوں میں رکھ دی) یعنی عیسیٰ کی پیروی کرنے والوں کے دلوں میں اور یہ لوگ حواری تھے اور ان کے دلوں میں جنہوں نے ان حواریوں کی پیروی کی۔ **رَاْفَةً** (ترجمہ:۔مہربانی) یعنی محبت پس وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ **وَّرَحْمَةً** (اور رحمت) جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے تھے۔**وَرَهْبَانِيَّةَ** (ترجمہ:۔اور ترک دنیا کا طریقہ) یہ رھب سے ہے جس کے معنی خوف ہیں۔کہا جاتا ہے۔**رھب الشئی ' رَهْبًا ورَهَبًا ورھبةً** یہ اس وقت کہتے ہیں جب آدمی کسی سے ڈرتا ہے۔اور **الرھب الرھبی** اور **الرھبوت** اور **الرھبوتی** اسم ہیں جب آدمی راھب بنتا ہے اور اللہ کا خوف رکھتا ہے تو کہتے ہیں ترھب۔اور راھب کہتے ہیں اس کو جو گرجا گھر میں عبادت کرتا ہو اور اس کا مصدر **الرھبة** اور **رھبا نیة** ہے اور راہب کی جمع رھبان ہے اور کبھی کبھی یہ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ابوعلی فارسی نے کہا کہ **رھبانیة** فعل مضمر کی وجہ سے منسوب ہے اور گویا کہ عبارت یوں ہے **ابتدعوا ورھبانیة ابتدعوھا**۔اس آیت میں پہلے والے منصوب لفظ پر معطوف نہیں ہے کیونکہ جو کچھ قلب میں رکھ دی جاتی ہے وہ اپنی طرف سے گھڑی ہوئی نہیں ہوتی۔جمہور اہل سنت کا یہ مسلک ہے کہ بندہ کا فعل اللہ کی خلق ہے اور بندہ کا کسب ہے پس اس تقدیر پر معنی ہوں گے **جعلنا فی قلوبھم رافةورحمة ورھبانیة مبتدعة من عند انفسھم** ہم نے ان کے دلوں میں مہربانی اور رحمت رکھ دی اور ان کی اپنی طرف سے گھڑی ہوئی رھبانیت بھی۔اس صورت میں "**ابتدعوھا**" رھبانیت کی صفت ہوگا۔اور ابوعلی فارسی نے

اس عقیدہ سے فرار حاصل کیا تو اس نے کہا رھبانیت فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر اللہ کے اس ارشاد ''ابتدعوھا'' سے ہوتی ہے۔اور یہی معتزلہ کا مسلک ہے اور زمخشری نے اسی کی پیروی کی ہے۔ابن اثیر کہتے ہیں کہ یہ عیسائیوں کے خوف کھانے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی کہا کہ اس کی اصل رھبۃ سے ہے جس کے معنی خوف کے ہیں وہ لوگ دنیا کی مصروفیت سے تنہائی حاصل کر کے اور اس کی لذتوں کو چھوڑ کر اور دنیا والوں سے الگ تھلگ رہ کر اور اس کی تکلیف کو برداشت کر کے رھبانیت اختیار کرتے تھے یہاں تک کہ ان میں سے بہت سارے لوگ اپنے نفس پر قابو پالیتے تھے اور اپنی گردن میں زنجیریں وغیرہ ڈال کر مختلف قسم کے عذاب برداشت کرتے تھے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ لوگ اشغال سے تنہائی اختیار کرتے تھے اور اہل واموال سے کٹ کر رہ جاتے تھے اور صحراؤں' غاروں اور پہاڑوں میں جا رہتے تھے تو نبی پاکؐ نے اسے اسلام سے دور فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے منع فرمادیا اور حدیث میں ہے **وعلیکم بالجھاد فانه رھبانیة امتی**۔(جہاد کرو یہی میری امت کی رھبانیت ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ رھبان نے اگرچہ دنیا کو چھوڑ دیا اور اس کے بارے میں زہد اور تخلیہ اختیار کرلیا پھر بھی اللہ کی راہ میں اپنے نفس کو خرچ کرنے سے بڑھ کر کوئی اور زہد وتخلیہ اور ترک نہیں ہے۔جس طرح نصاریٰ کے نزدیک رھبانیت سے بڑھ کر اور کوئی افضل عمل نہیں ہے تو اسلام کے اندر جہاد سے بڑھ کر اور کوئی افضل عمل نہیں ہے۔اسی وجہ سے حضورؐ نے ارشاد فرمایا''**ذروۃ سنام الاسلام الجھاد فی سبیل الله**'' یعنی اسلام کی سب سے بلند چوٹی اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ **ابْتَدَعُوْهَا** (ترجمہ:۔انہوں نے اسے خود ہی نکالا) یعنی انہوں نے (عیسائیوں نے) ایجاد کیا اور وہ غلط طور پر نہیں تھا بلکہ دین کی حفاظت کی خاطر یہ طریقہ ایجاد کیا۔حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن مسعود تمہیں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل ستر فرقوں میں تقسیم ہوگئے جن میں سے تین کے سوا سارے جہنمی ہیں اور ان تین میں سے ایک فرقہ تو وہ ہے جو عیسیٰ پر ایمان لایا اور انہوں نے اللہ کے دشمنوں کے ساتھ ان کی حمایت میں قتال کیا۔ یہاں تک کہ خود شہید ہوگئے۔دوسرا فرقہ ان لوگوں کا تھا جنہیں قتال کی طاقت نہ تھی تو وہ محض معروف کا حکم دیتے رہے اور منکر سے منع کرتے رہے۔اور تیسرا فرقہ ان لوگوں کا تھا جن میں ان دونوں کاموں کی طاقت نہ تھی انہوں نے عبائیں پہن لیں اور ویرانوں اور میدانوں کی طرف نکل گئے۔پس انہوں نے اس تخلیہ اور آبادیوں سے دوری کو محض دین کی حفاظت کے لئے ایجاد کیا۔اسی لئے اللہ نے فرمایا **مَا كَتَبْنٰهَا** (ترجمہ:۔ہم نے اسے فرض نہیں کیا تھا) یعنی اس رھبانیت کو لازم نہیں کیا تھا **عَلَيْهِمْ** (ترجمہ:۔ان پر) یعنی ان رھبانیت اختیار کرنے والوں پر۔**اِلَّا** (ترجمہ:۔مگر) یعنی لیکن انہوں نے اسے اختیار کیا تھا **ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔اللہ کی رضا جوئی کی خاطر) یعنی اللہ کی خوشنودی طلب کرتے ہوئے۔زجاج نے کہا کہ اس کے معنی ہیں کہ ہم نے ان پر اللہ کی رضا طلب کرنے کے سوا لازم نہیں کیا تھا۔اسی صورت میں ''الا ابتغاء رضوان اللہ'' کا ارشاد گرامی ما کتبناھا کی ضمیر سے بدل ہوگا۔ **فَمَا رَعَوْهَا** (ترجمہ:۔تو انہوں نے اس کی رعایت نہیں کی) یعنی اس رھبانیت کی جسے انہوں نے اپنی طرف سے اختیار کیا تھا۔**حَقَّ رِعَايَتِهَا** (ترجمہ:۔جو اس کی رعایت کا حق تھا) یعنی اس کی حفاظت کا حق بلکہ انہوں

نے اسے ضائع کر دیا اور عیسیٰ ؑ کے دین کا انکار کیا اور اس رھبانیت کے ساتھ تثلیث کا نظریہ بھی شامل کر لیا۔ پس وہ گمراہ ہو گئے اور راھب ہونے کے باوجود بھی ذلیل ہو گئے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ کی رضا مندی کیلئے اختیار کئے گئے زہد کے ساتھ تعلق رکھنے والے نئے امور پر معروف معنی پر بدعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ (فمارعوھا حق رعایتھا) کبھی نہ ارشاد فرماتا۔ پس یہ امور باوجود یہ کہ منویہ تھے وہ وجوب ولزوم میں نذر منت کی طرح ہو گئے جس طرح نذر ومنت کی ادائیگی مکلّف پر واجب ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے اختیار کردہ امور کی ادائیگی بھی لازم تھی لیکن انہوں نے اسے ضائع کر دیا اور ان بادشاہوں کے دین میں داخل ہو گئے جنہوں نے مسیح علیہ السلام کے دین میں تحریف کی اور انہوں نے رھبانیت کو ترک کر دیا تو وہ پکڑ لئے گئے۔ **فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ** (ترجمہ: تو ہم نے ان میں سے ایمان لانے والوں کو ان کا اجر عطاء فرما دیا) یعنی جس کے وہ ایمان کی وجہ سے مستحق تھے **وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ** (ترجمہ:۔ اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں) یعنی اللہ کے حکم وایمان سے خارج ہیں۔

(۲۸) **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا** (ترجمہ:۔ اے ایمان والو) اس سے یہود ونصاریٰ اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے مراد ہیں۔ **اتَّقُوا اللّٰهَ** (ترجمہ:۔ اللہ سے ڈرو) اس چیز کو چھوڑ کر جس سے اس نے تمہیں منع کیا ہے۔ اور جن شرائع کا حکم دیا ان کی ادائیگی کر کے۔ **وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ** (ترجمہ:۔ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ) یعنی محمدؐ پر جیسا کہ ان کے انبیاء علیہم السلام نے انہیں ان کے آنے کی خبر بھی دی تھی۔ **يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ** (ترجمہ:۔ وہ تمہیں دو حصے عطا فرمائے گا) فراء کہتے ہیں کہ **کفل** کے معنی ہیں حصہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض نے اس لفظ کو اجر واثم دونوں کے لئے عام رکھا ہے۔ اور **له کفلان** کہا جاتا ہے۔ ''**هذا کفل فلان**'' نہیں کہا جاتا۔ تاکہ دوسرے کے لئے اس جیسا اور حصہ بناؤ جب آپ اسے مفرد رکھیں گے تو کفل ونصیب نہیں کہیں گے حدیث جمعہ میں ہے کہ **کفلان من الاجر** اور اسی معنی میں یہ ارشاد گرامی ہے۔ اور حدیث جابر میں ہے۔ **وعمد نا الی اعظم کفل** ہم نے بڑے نصیب کا ارادہ کیا ہے۔ زجاج نے کہا لغۃ میں کفل کے معنی ہیں نصیب (حصہ) عربوں کے قول میں سے ماخوذ ہے۔ **اکتفلت البعیر علی سنامه اوعلی موضع من ظهره کساء ورکبت علیه.** کفل اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی پوری پیٹھ استعمال نہیں کی جاتی بلکہ اونٹ کا کچھ حصہ استعمال کیا جاتا ہے اور بعض نے کہا کہ **کفل کساء** چادر ہے جو پالان کے نیچے رکھا جاتا ہے اور اسی سے ابوغریب کا قول ہے۔ **علی جسرة مرفوعة الذیل والکفل.** مورج نے کہا کہ **کفل** ھذیل کی لغت میں نصیب کو کہتے ہیں۔ اور ابوموسیٰ الاشعریؓ نے فرمایا کہ **کفل** حبش کی زبان میں ضعف ہے یعنی دو چند (دگنا) **مِنْ رَّحْمَتِهٖ** (ترجمہ:۔ اپنی رحمت سے) یعنی اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے۔ ابوموسیٰ الاشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تین لوگوں کے لئے دوہرا اجر ہے۔ اہل کتاب کا وہ شخص جو اپنے نبی اور محمدؐ پر ایمان لایا اور کسی کا عبد (غلام) جس نے اپنے آقا کا اور اللہ کا حق ادا کر دیا ہوا اور وہ آدمی جس کے پاس کوئی کنیز ہو۔ جب کوئی سزا دی ہو تو عمدگی سے دی ہو۔ جب اس کی تعلیم دی ہو تو نہایت عمدگی سے دی ہو پھر اس کو آزاد کر کے اس کو اپنی زوجہ

بنالیا ہو اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اہل کتاب میں سے محمدؐ پر ایمان لانے والا اس شخص سے افضل تھا جو نبیؐ پر ایمان لایا۔ امام رازی نے اس کے جواب میں فرمایا جب مال دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ایک کفل اس کا نصف ہوگا اور جب مال کو سو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا تو اس کا ایک کفل سو میں سے ایک ہوگا اور پہلی تقسیم والا کفل دوسری تقسیم والے کفل سے چالیس گنا زیادہ ہوگا پس اسی طرح وہ کفل جو اللہ محمدؐ پر ایمان لانے والے کو عطاء فرمائے گا زیادہ ہوگا از روئے حصہ اس آدمی کے حصہ سے اللہ دو کفل عطا فرمائے گا۔ **وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا** (ترجمہ:۔ اور تمہارے لئے نور پیدا کردے گا) اس سے مراد قران ہے کیونکہ یہ مومن کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکال کر لے جاتا ہے۔ اور یہ اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ پل صراط کا نور ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا **نورهم يسعى بين ايديهم.** (التحريم۸) **تَمْشُوْنَ بِهٖ** (ترجمہ:۔ کہ تم اس میں پاؤ گے) یعنی اس نور کی روشنی میں۔ **وَيَغْفِرْ لَكُمْ** (ترجمہ:۔ وہ معاف کرے گا تمہیں) جو کچھ تم نبی مکرمؐ پر ایمان لانے سے قبل گناہ کر چکے ہوں۔ کیونکہ ان کی تصدیق مقام نور وضیاء میں ولادت ثانیہ کے مترادف ہے اور یہ مولود کفر کی غلاظت اور گناہوں کی نجاست نہیں ہوگی۔ **وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ** (ترجمہ: اور بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے) یعنی مغفرۃ میں مبالغہ ہے **رَّحِيْمٌ** (ترجمہ:۔ بہت زیادہ مہربان ہے) رحمت میں بہت ہی کثیر ہے)

(۲۹) **لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ** (ترجمہ:۔ تاکہ اہل کتاب جان لیں) جمہور نے **لئلا يعلم** پڑھا ہے اور **لا** زائدہ ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا **ما منعک الّا تسجد** (الاعراف ۱۲) **ای مامنعک ان تسجد**۔ (یعنی کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا۔) فراء اور اخفش نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ اہل کتاب میں سے وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے اور متقی نہیں ہیں وہ جان لیں۔ **اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ کہ وہ اللہ کے فضل پر کوئی حق نہیں رکھتے) جو محمدؐ پر ایمان لائے اللہ کا فضل اسی پر ہوتا ہے۔ مروی ہے کہ رسولؐ نے حضرت جعفرؓ کو نجاشی کے پاس ستر سواروں کے ساتھ بھیجا کہ اس کو دعوت اسلام دیں۔ حضرت جعفرؓ اس کے پاس گئے اس کو دعوتِ اسلام دی۔ اس نے قبول کرلیا تو اس کی مملکت کے چالیس آدمیوں نے جو ایمان لا چکے تھے تو کہا ہمیں اجازت دیں کہ ہم رسول اللہؐ کے وفد میں شامل ہوں۔ اس نے انہیں اجازت دے دی وہ حضرت جعفر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت حضور ﷺ جنگ احد کے لئے تیار تھے جب ان نو واردوں نے مسلمانوں کے جذبۂ ایثار وقربانی کو دیکھا تو رسول اللہ ﷺ سے اجازت مانگی وہ واپس گئے اور اپنے اموال کے ساتھ دوبارہ حاضر خدمت ہوگئے اور اپنا مال لاکر مسلمانوں کو پیش کیا۔ جس پر اللہ نے فرمایا **الذين اتيناهم الكتاب..... مما رزقنٰهم ينفقون** (القصص ۵۲، ۵۳، ۵۴) تو جب اہل کتاب میں سے ایمان نہ لانے والے لوگوں نے اللہ کا ارشاد گرامی **يوتون اجرهم مرتين** (القصص ۵۴) سنا تو وہ مسلمانوں پر فخر کرنے لگے۔ اور کہنے لگے جو بھی تمہاری کتاب اور ہماری کتاب پر ایمان لایا اس کے لئے دو مرتبہ اجر ہیں اور جو کوئی تمہاری

کتاب پر ایمان نہیں لایا تو اس کا تمہارے اجر کی طرح اجر ہے تو پھر تمہاری ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی طرح صاحب کشاف نے ذکر کیا اور معنی یہ ہیں کہ اہل علم جان لیں کہ وہ اللہ کے فضل پر ذرا سی بھی قدرت نہیں رکھتے کیونکہ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس پر فضل فرماتا ہے۔ وہ قادر ہے کہ محمدؐ پر ایمان لانے والے پر اپنے فضل میں اضافہ کر دے۔ **وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ اور یہ کہ فضل (برتری) اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے) جو اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر کوئی بھی قادر نہیں۔ **يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ** (ترجمہ:۔ وہ عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے) یعنی اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے نوازتا ہے اور فضل سے مراد وہ شئی ہے جو عمل کے مقابلے میں نہیں ہے۔ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے عمل تقسیم کر دیا ہے اواجر بھی تقسیم کر دیا ہے اور دوسری روایت میں یوں ہے کہ وقت کو بانٹ دیا ہے پس یہود سے کہا گیا عمل کرو تو انہوں نے عمل نصف النہار تک کیا۔ تو ان سے کہا گیا تمہارے لئے ایک قیراط ہے اور نصاریٰ سے کہا گیا عمل کرو انہوں نے نصف النہار سے عصر تک عمل کیا تو ان سے کہا گیا تمہارے لئے ایک قیراط ہے۔ اور مسلمانوں سے کہا گیا عمل کرو تو انہوں نے عصر سے غروب آفتاب تک عمل کیا تو ان سے کہا گیا تمہارے لئے دو قیراط ہیں۔ یہود نے اس پر کہا کہ نصف النہار تک عمل کرنے پر ہمارے لئے ایک قیراط ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ نصف النہار سے عصر تک عمل کرنے پر ہمارے لئے بھی ایک قیراط ہے اور جو عصر سے غروب آفتاب تک عمل کرتے ہیں تو ان کے لئے دو قیراط۔ تو اللہ نے فرمایا **لئلا یعلم اھل الکتاب الا یقدرون علی شئی من فضل اللہ الی الآخر**) پھر آپ نے فرمایا کہ تمہاری مثال سابقہ امتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسی کہ عصر سے لے کر غروب آفتاب تک۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے ذکر کیا ہے۔ اور سیوطی نے اپنی تفسیر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ اللہ کا فضل اسی کے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ **وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ** (ترجمہ:۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے) اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ رب نے اللہ اور رسول پر ایمان لانے والوں پر دگنے اجر و ثواب سے فضل فرمایا اور یہ بھی کہا گیا فضل سے مراد اللہ کی وہ نعمتیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

**تمّ تفسیر ھذہ السورۃ بعون اللہ الملک القدیر والصلوٰۃ علی رسولہ البشیر والنذیر وعلی آلہ الذین انزل اللہ فیھم آیۃ التطھیر**